سرپرست: مولانا وحید الدین خاں

ایڈیٹر: ظفر الاسلام خاں ایم اے

سورج پچھم میں غروب ہوتا ہے تاکہ دوبارہ پورب سے نئی شان کے ساتھ طلوع ہو۔ یہ ایک روشن نشانی ہے جو آسمان پر ظاہر ہو کر ہر روز ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی مملکت کا نظام کس طرح بنایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک کائناتی اعلان ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کوئی "غروب" آخری نہیں۔ ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔ غروب کا واقعہ پیش آنے کے بعد وہ ازسرِنو اپنی جدوجہد کا منصوبہ بنائے۔ زندگی کی شاہ راہ پر دوبارہ اپنا سفر شروع کر دے۔

جلد ۱ | شمارہ ۱ | زرِتعاون سالانہ: ۲۴ روپے، خصوصی تعاون: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ | اکتوبر ۱۹۷۶

مسلم قیادت موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ اس کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست بازی کا مطلب ہے، اپنے مسائل کے حل کے لئے دوسروں کے خلاف مہم چلانا۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر عمل کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کے عقائد مضبوط ہوں، ان کے اندر اخلاق کی طاقت ہو، وہ تعلیم میں اونچے ہوں، ان میں باہم اتحاد ہو اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ سماجی بہبود کے ادارے ان کے درمیان چل رہے ہوں۔ وہ زمانے کو پہچانیں اور اس کے مطابق کام کرنا جانتے ہوں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندر وہ شعور ابھارا جائے کہ وہ صاحبِ نظریہ افراد کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہ سکیں۔ انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دار و مدار ہے لیکن مسلمانوں نے دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامہ آرائی تو خوب کی، خود اپنی تعمیر کے لئے کوئی کام نہ کیا۔

مزید نادانی یہ ہے کہ سیاست بازی سے جب وہ کامیاب نہ ہو سکے تو اب انھوں نے دوسرا مشغلہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھیرا رہے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی باتوں سے نہ صرف یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کے الفاظ میں، انھوں نے کلمۂ طیبہ کا درخت نہیں اگایا تھا، بلکہ کلمۂ خبیثہ کا درخت اگایا تھا۔ کیونکہ کلمہ طیبہ کے درخت کے لئے خدا کا اعلان ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ یہ انجام صرف کلمہ خبیثہ کے درخت کے لئے مقدر ہے کہ جو چاہے ہاتھ بڑھا کر اس کو اکھاڑ لے۔ (ابراہیم)

الرسالہ کا مقصد تعمیری اور اصلاحی ذہن پیدا کرنا ہے

اردو زبان، دستورِ ہند کی لسانی فہرست میں چودھویں نمبر پر ہے۔ مگر ملک میں اخبارات و رسائل کی تعداد کے اعتبار سے اس کا نمبر تیسرا ہے۔ ایسی حالت میں ایک نیا اردو رسالہ نکالنے کا ارادہ ہم نے کیوں کیا۔ جواب یہ ہے کہ تعداد کی کثرت کے باوجود اردو صحافت میں بعض خانے خالی تھے۔ اور الرسالہ کے ذریعہ ہم انھیں خانوں کو پُر کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا مقصد مختصر لفظوں میں "تعارفِ اسلام" ہے۔ مسلمان، ختمِ نبوت کے بعد، نبوت کے قائم مقام ہیں۔ انھیں بعد کے زمانوں میں خدائی پیغام رسانی کے ٹھیک اسی کام کو انجام دینا ہے جو پچھلے زمانوں میں انبیاء کرتے رہے ہیں۔ پیغام رسانی کا یہ اہتمام اللہ نے اس لئے کیا ہے کہ قیامت میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کو ایک ایسے معاملہ میں پکڑا جا رہا ہے جس کی بات ہم کو بتایا نہیں گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم دوسروں کو خدا کی مرضی سے آگاہ نہ کریں تو دوسروں سے پہلے خود ہم کو پکڑا جائے گا کہ اپنے فرضِ منصبی کو ادا کیوں نہ کیا۔ یہ اتنی سنگین بات ہے کہ اس ذمہ داری سے غفلت برتنے کے بعد کوئی بھی ذاتی عمل مسلمانوں کو خدا کے یہاں بچا نہیں سکتا۔

مگر مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ دوسری قوموں کے سامنے اسلام کی پیغام رسانی کا کام نہیں کیا، بلکہ اپنے عمل سے اسلام کا الٹا تعارف کرایا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر جو تحریکیں ہمارے درمیان اٹھیں ان کا تجربہ یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ، علیحدہ قومیت مناظرہ بازی، سیاسی محاذ آرائی اور حقوق طلبی لوگوں کی نظر میں اسلام بن گئے ہیں۔ حالاں کہ قرآن میں جو اسلام ہے اس کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کا اسلام تو بس یہ ہے کہ: انسان اپنے مالک سے ڈرے، اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ مرنے کے بعد اس کو خدا کے یہاں حساب دینا ہے —— اسلام اس لئے آیا تھا کہ انسانوں کو آخرت کے مسائل کی طرف متوجہ کرے، ہم نے اس کو دنیوی مسائل کی طرف متوجہ کرنے کا عنوان بنا دیا۔

مسلمانوں کو داعی کی حیثیت سے اٹھانا، آج ملتِ اسلامیہ کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس ذمہ داری کو چھوڑنے کی وجہ سے وہ خدا کی نصرت سے محروم ہو گئے ہیں اور دوبارہ اسی ذمہ داری کو پورا کر کے وہ خدا کی نصرتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

اس کام کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ الرسالہ کم از کم پانچ زبانوں میں جاری ہو: اردو، ہندی، عربی، فارسی، انگریزی۔ یہ اللہ کا فضلِ خاص ہے کہ ہم کو ایسے افراد حاصل ہیں جو ان زبانوں میں اعلیٰ معیار کا ماہنامہ مرتب کر سکتے ہیں۔ مگر ان کو فارغ کرنا اور چھپائی اور تقسیم کے تمام مراحل کے اخراجات، ان سب کے لئے کثیر مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ تاہم جس خدا نے قحط الرجال کے اس دور میں ہم کو انسانی وسائل دیئے ہیں ہمیں امید ہے کہ وہ خدا فراوانیٔ دولت کے اس دور میں مالی وسائل بھی ضرور مہیا فرمائے گا۔ انشاء اللہ جلد وہ وقت آئے گا جب کہ الرسالہ کے اڈیشن متعدد دوسری زبانوں میں بھی نکلیں اور تمام اقوام تک اس کے خیالات کی اشاعت ممکن ہو سکے۔

الرسالہ کے ساتھ ایک مکتبہ بھی ہو گا جس میں خصوصیت کے ساتھ اسلام کے تعارف پر کتابیں شائع کی جائیں گی۔ ہماری کوشش ہو گی کہ مثبت انداز میں، بغیر کسی تعبیری یا کلامی اضافہ

کے قرآن، حدیث، سیرت، حالات صحابہ اور تاریخ اسلام پر کتابیں تیار کی جائیں اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کیا جائے اسی کے ساتھ ایسا لٹریچر تیار کرنا بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہوگا جو وقت کی زبان اور عصر حاضر کی اصطلاحوں میں اسلام کی تشریح کرے۔ اس کے علاوہ ایسی کتابوں کی بھی ضرورت ہے جو مسلمانوں کے اندر تعمیری ذہن اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کریں اور ان کو بتائیں کہ قوموں کی زندگی کا راز دوسروں سے لاحاصل مقابلہ آرائی میں نہیں، بلکہ خود اپنی تعمیر میں ہے۔ اسی طرح کچھ ایسی کتابیں بھی درکار ہیں جو علمی انداز میں تیار کی جائیں اور اسلام کے داعیوں کے لئے معاون کا کام دیں۔ مثلاً تاریخ انبیاء، مذاہب کی تاریخ، قاموس الاسلام، فکر جدید کا تعارف وغیرہ۔

یہ کام ایک انتہائی اہم کام ہے اور پوری طرح انجام دینے کے لئے بہت زیادہ وسائل و ذرائع چاہتا ہے۔ بلکہ ضرورت تو یہ ہے کہ دہلی یا اور کسی مناسب مقام پر ایک اعلیٰ معیار کا اسلامی مرکز قائم کیا جائے جو ان تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لئے سرگرم ہو۔ اس میں تقابلی مذاہب کے مطالعہ کا ادارہ ہو۔ عربی اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا اعلیٰ مدرسہ ہو۔ مختلف زبانوں کا معیاری دارالاشاعت ہو۔ غیر مسلموں سے ربط قائم کرنے کے لئے ہر قسم کے عمدہ انتظامات ہوں، اسلام اور دیگر مذاہب و فلسفہ پر وسیع کتب خانہ ہو۔ لکچر ہال اور ریڈنگ روم ہو، تحقیق و تصنیف کے ادارے ہوں۔ پھر اس میں جدید ترین طرز کا ایک اسلامی میوزیم ہو جس میں اسلام کی تاریخی چیزوں کو تصویروں کے ذریعے پروجکٹ کیا جائے۔ یہ میوزیم اس بات کا ایک خاموش اعلان ہوگا کہ اسلام مکمل طور پر ایک تاریخی مذہب ہے نہ کہ محض دور قدیم کی ایک داستان جو غیر معتبر کہانیوں کے ذریعے چلی آرہی ہے۔

ستمبر ۱۹۷۵ء میں سری نگر میں ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی جس کے چیرمین وزیر اعلیٰ کشمیر شیخ محمد عبداللہ تھے۔ اس موقع پر مرکزی وزیر سیاحت مسٹر راج بہادر نے بتایا کہ مغربی ایشیا اور خلیج فارس کے ملکوں کے سیاحوں کو ہندوستان کی طرف مائل کرنے کے لئے حکومت ہند بہت سے نئے اقدامات کر رہی ہے۔ ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے ایک فلم تیار کیا ہے جس میں انڈین کلچر کے ذیل میں خصوصی طور پر اسلام کو دکھایا گیا ہے (ہندوستان ٹائمس۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۵ء)

نومبر ۱۹۷۵ء میں دہلی میں قرأت قرآن کے مقابلے کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے وزیر ریلوے مسٹر شفیع قریشی نے کہا کہ یہاں ایک "قرآن گھر" قائم ہونا چاہئے جس کا خاص مقصد یہ ہو کہ قرآن کے ترجمے مختلف زبانوں میں تیار کر کے سارے ملک میں پھیلائے جائیں۔

جون ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتہ میں بمبئی میں بیت الحجاج کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ۲۰ منزلہ عمارت ۵ر۲ کروڑ روپے کی لاگت سے بنائی جائے گی۔ حکومت مہاراشٹر نے اس کے لئے زمین اور ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ صوبائی کانگرس نے ۱۵ ہزار اور مسٹر کے این مودی نے ۵۰ ہزار روپئے دیئے۔ عطیات کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ نائب وزیر خارجہ مسٹر بپن پال داس نے بتایا کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی اس منصوبہ میں خصوصی دلچسپی لے رہی ہیں۔

اس تقریب کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد نے کہا کہ وقت آگیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو پھیلایا جائے اور اس کے بارے میں غلط فہمیاں دور کی جائیں۔ انھوں نے کہا "دنیا آج روحانی بحران سے گزر رہی ہے اور آج سب سے زیادہ اس کو خدائی روشنی کی ضرورت ہے۔"

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ بہترین موقع ہے جبکہ اسلامی مرکز کی اسکیم کو وجود میں لایا جائے۔ اس قسم کا مرکز اگر معیاری انداز سے قائم ہو جائے تو وہ اس ملک میں اسلام کا ایک تاج محل ہوگا جو شاہجہاں کے تاج محل سے بھی زیادہ مسلم ممالک کے سیاحوں کو ہندوستان کی طرف کھینچنے کا سبب بنے گا۔

یہ جدوجہد حیات کا ایک سبق ہے

رمضان کا مہینہ آدمی کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے لڑنے کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جبکہ مومن شیطانی طاقتوں کو زیر کرکے اس کے اوپر قابو پاتا ہے اور دوبارہ خدا کی بندگی کا عزم لے کر نئے سال میں داخل ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ روحانی مقابلہ کا یہ مہینہ اسلام کی تاریخ میں فوجی مقابلہ کا مہینہ بھی رہا ہے۔ اسلام اور غیر اسلام کے کئی تاریخی معرکے اسی مبارک مہینہ میں پیش آئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

غزوۂ بدر (۶۲۴ء) جس نے پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کو قریش کے اوپر فیصلہ کن فتح دی۔

فتح مکہ (۶۳۰) جس نے پوری عرب دنیا پر اسلام کو غالب کر دیا

غزوۂ تبوک (۶۳۲) جس نے رومیوں کے اوپر اہل اسلام کی دھاک قائم کر دی۔
(رجب میں شروع ہو کر رمضان میں ختم ہوا)

معرکۂ عین جالوت (۱۲۶۰) جس نے تاتاریوں کو شکست دے کر بغداد کی مسلم سلطنت کو دوبارہ زندہ کیا۔

مصر۔ اسرائیل جنگ (۱۹۷۳) جس نے نہر سوئز اور صحرائے سینا کے تیل کے چشموں کو دوبارہ مصر کے قبضہ میں دے دیا۔

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ روزہ اور جدوجہد حیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ روزہ کی بھوک پیاس آدمی کو کمزور نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس قابل بناتی ہے کہ زندگی کے معرکہ میں وہ زیادہ جاں فشانی کے ساتھ حصہ لے سکے۔

ایک واقعہ

ابوبکر بن عباس خوارزمی (۳۸۳۔ ۳۲۳ھ) ذہانت و حافظہ میں ضرب المثل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ارجان میں صاحب بن عباد وزیر سے ملنے گئے۔ دروازہ پر پہنچے تو دربان اندر گیا اور صاحب سے جاکر کہا کہ دروازہ پر ایک ادیب آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ وزیر نے کہا ان سے کہو "میں نے طے کر لیا ہے کہ میرے پاس کوئی ادیب اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک اسے عرب کے ۲۰ ہزار اشعار زبانی یاد نہ ہوں" خوارزمی نے یہ بات سنی تو دربان سے کہا کہ جاؤ ان سے دریافت کرو کہ ۲۰ ہزار اشعار مردوں کے یا عورتوں کے۔

یہ سنکر وزیر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ ابوبکر خوارزمی معلوم ہوتے ہیں" اور فوراً اندر بلا لیا۔

ان کا مقصد اللہ کے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانا تھا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خیبر فتح کرنے کے لئے بھیجتے ہیں حضرت علی رضؓ نے پوچھا۔ "یا رسول اللہ! کیا جاتے ہی قتال شروع کردوں؟" حضور نے فرمایا۔ "وہاں جاکر ٹھہرو اور لوگوں کو لا الٰہ الا اللہ کی طرف بلاؤ۔ اگر نہ مانیں تو دوسرا معاملہ کرنا، اس لئے کہ لان یھدی اللّٰہ منک رجلاً خیر لک من الدنیا و ما فیھا۔ ایک آدمی کو بھی تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہدایت کردے تو وہ تمہارے لیے دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ تم کو جوان اونٹوں کے ملنے سے بھی یہ بہتر ہے۔

مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضؓ عرب سے کیوں نکلے؟ وہ عراق میں پہنچے۔ شام، ایران، افغانستان، سندھ، یوپی، بہار اور جنوب میں دکن تک پہنچے۔ یہاں تک کیوں پہنچے؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا ملک فتح کرنا تھا؟ دولت لوٹنی تھی؟ ہرگز نہیں! ان کا اصلی مقصد صرف لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دینا تھا۔ دنیا کو سچے دین پر لانا تھا۔ اللہ کے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانا تھا۔ اور دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرنا تھا۔

بعد والوں نے بے وقوفی کی کہ دنیا کے پیچھے پڑ گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہند میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد صرف چار یا پانچ لاکھ تھی۔ مگر تقسیم ہند کے وقت دس کروڑ پچیس لاکھ مسلمان تھے۔

ہمارے بزرگ اسلاف نے اور اولیاء کرام نے تبلیغ دین کے لئے بہت ہی کوششیں کیں۔ ایک انگریز سمتھ لکھتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی

لوگوں کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرنا تھا

رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر نوے لاکھ مسلمان ہوئے۔ ان کے پاس کیا تھا؟ کوئی فوج تھی؟ فقط اللہ کی معرفت کا خزانہ تھا۔ ہر جگہ اللہ کے سچے بندے گزرے ہیں جنھوں نے دین کی تبلیغ کی۔ میں نے تاریخ ترکی میں دیکھا کہ ترک قوم کے تین لاکھ خاندان ایک دن میں مسلمان ہوئے۔ اللہ کا کرم کہ تبلیغ کی کوشش وہ پھل لائی کہ ایک زمانے میں بعض حکام کو یہ تدبیر کرنی پڑی کہ وہ اپنی رعایا کو مسلمان ہونے سے روکیں ۱۰۰ھ میں خلافتِ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں خراسان کے حاکم کو یہ خطرہ ہوا کہ جزیہ بند ہونے سے خزانہ خالی ہو جائے گا۔ اس لئے اعلان کرنا پڑا کہ کسی کا اسلام اس وقت تک قبول نہ کیا جائے گا۔ جب تک کہ وہ ختنہ نہ کرلے۔ بوڑھوں کے لئے تکلیف دہ بات تھی۔ اس حکم کے جاری ہونے سے اسلام کی ترقی رک گئی۔ اب خلیفہ کو اطلاع ملی کہ والئ خراسان نے اسلام پر پابندی لگادی ہے تو آپ نے اس کو معزول کر کے دوسرے کو مقرر کر دیا۔ اور فرمایا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے آئے تھے کہ اس پر اسلام کو موقوف رکھا جائے؟

ہمارے اسلاف کی کوششوں سے اہل اللہ علماء کرام اور عام مسلمانوں کی کوششوں سے دس کروڑ پچیس لاکھ مسلمان ہو گئے۔ اگر غلط کاری نہ ہوتی تو یقیناً ملک کا اکثر حصہ مسلمان ہو جاتا۔

تقریر بمقام آرکونم (مدراس) ۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء

الرسالہ۔ اکتوبر ۱۹۷۶

دوسروں کو کم تولنا اور اپنے لئے پورا تول لینا

"آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو اپنے گھیرے میں لے لے گا" (ہود - ۸۴) یہ پیغمبرانہ آواز حضرت شعیب علیہ السلام کی تھی جو انھوں نے ساڑھے تین ہزار برس پہلے مدین والوں کو سنائی۔

مدین، قدیم عرب میں بحر احمر کے کنارے ایک شہر تھا۔ حضرت ابراہیم (۱۹۸۵ - ۲۱۶۰ ق م) کی بیوی قطورہ کے بطن سے آپ کے ایک صاحبزادے مدین نامی پیدا ہوئے۔ انھیں کی نسل ابتداءً یہاں آباد ہوئی اور ان کے نام پر شہر کا نام مدین رکھا گیا۔ انھیں مدین کی نسل سے، حضرت ابراہیم کے تقریباً ۵ سو برس بعد، حضرت شعیب پیدا ہوئے۔ اس وقت تک مدین کی قوم میں کافی بگاڑ آگیا تھا۔ اللہ نے حضرت شعیب کو پیغمبری عطا کی اور ان کو مامور کیا کہ حضرت ابراہیم کی اس بگڑی ہوئی اولاد کو حق کا پیغام سنائیں۔ قوم مدین کی کیا خرابی تھی جس کی وجہ سے ان کے بارے میں کہا گیا کہ تم اپنے آج کے اچھے حال پر خوش مت ہو۔ کیونکہ آئندہ تمھارے لئے شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔ وہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ وہ ناپ تول پورا نہیں کرتے تھے اور لوگوں کو چیزیں دینے میں کمی کرتے تھے (اعراف - ۸۵) اس اخلاقی بیماری کو قرآن میں دوسرے مقام پر ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے "خرابی ہے گھٹانے والوں کے لئے، جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں، اس دن جب کہ سارے لوگ مالک کائنات کے سامنے کھڑے ہوں گے" (التطفیف)

"اپنے لئے بھرپور لینا اور دوسروں کو دینے میں کمی کرنا" ایک وہ ہے جو دکان داروں کے یہاں ملتا ہے۔ جو دکان دار ایسا کرتا ہے کہ اپنے لئے ناپنا اور تولنا ہو تو زیادہ لینے کی کوشش کرے اور دوسروں کو دینا ہو تو چاہے کہ کسی نہ کسی طرح اس میں گھٹا دوں، خواہ ناپنے اور تولنے میں کمی کر کے یا ملاوٹ اور خلاف نمونہ چیز دے کر، وہ خدا کے یہاں ملعون ہے اور اس کی ساری کمائی حرام کی کمائی ہے۔ اپنے اس دھوکے بازی کے کاروبار سے وہ خواہ کتنا ہی نفع حاصل کر رہا ہو، آخرت کے دن وہ سخت ترین گھاٹے میں ہوگا۔

تاہم اس ذہنیت کا تعلق صرف دکان داری سے نہیں ہے بلکہ انسانی تعلقات کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ "جو اہل علم اپنے معاصر فضلا کی تعظیم و توقیر کا حق ادا نہیں کرتے" وہ بھی اس آیت کے ذیل میں آجاتے ہیں"۔ اسی پر ان تمام دوسری صورتوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے جب کہ آدمی اپنے لئے تو چاہتا ہے کہ اپنے واقعی حق سے بھی زیادہ وصول کرلے اور دوسرے کو اس کے واجبی حق کے بقدر دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔

ایسی شاندار چیزیں خدا کے یہاں کہاں!

نئی دہلی کے بین اقوامی صنعتی میلے (۱۹۶۱) میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کی نمائش کی گئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ زمین پر بھی دوڑتی تھی اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بلند ہو کر بھی اڑتی تھی۔ ایک نوجوان سادھو جب نمائش کے مختلف عجوبوں اور رنگینیوں کو دیکھتا ہوا امریکی پویلین کے پاس پہنچا اور اس جادوئی گاڑی کو اڑتے اور دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس کے ذہن میں ایک نیا سوال پیدا ہو گیا۔ "کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں"، سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندستانی نوجوان ۲۰ منٹ تک اس امریکی موٹر کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے "مستقبل کی کار" کا نام دیا تھا۔ جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا: "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں۔" (ہندوستان ٹائمس۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۱ء)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پڑھئے۔

جولائی۔ اگست ۱۹۷۵ میں بہار میں ہولناک سیلاب آیا تھا۔ اس میں بہت سے خاندان بے گھر ہو کر مجبور ہوئے کہ کسی دوسری جگہ اپنے لئے پناہ گاہ تلاش کریں۔ انھیں مصیبت زدگان میں ایک غریب مسلم خاندان دہلی آیا۔ گھر کا مرد طوفان میں ختم ہو چکا تھا۔ ۱۲ سال کے یتیم لڑکے شریف اور اس کی دبلی اور بیمار ماں کو جو امید دہلی لائی، وہ یہ تھی کہ اس کا داماد یہاں رکشا چلا کر اپنی روزی کما رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ رکشا کھینچنے والا ایک شخص دو خاندانوں کی پرورش کس طرح کر سکتا تھا۔ شریف کو ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اولاً کچھ دنوں ایک معمولی ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا رہا۔ اس کے بعد ایک خوش حال مسلم خاندان میں اس کو گھریلو کاموں کے لئے ۵۰ روپے ماہوار پر جگہ مل گئی۔

شریف ایک انتہائی غریب خاندان کا لڑکا تھا۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد اسے جو بستر ملا وہ زمین پر بچھا ہوا ایک ٹاٹ تھا۔ اب تک کی زندگی اس نے اس طرح گزاری کہ نہ کبھی اس کے پاؤں میں جوتا پڑا اور نہ جسم پر پورا لباس پہننے کو ملا۔ سردیوں کی رات کے معنی اس کے نزدیک صرف یہ تھے کہ لکڑی کے ٹکڑے اور پتیاں جمع کر کے کچھ دیر آنچ اور دھوئیں میں گزارے جائیں اور اس کے بعد ایک پھٹا ہوا ٹاٹ بچھا کر دوسرا پھٹا ہوا ٹاٹ اوپر سے لپیٹ لیا جائے۔

دسمبر کی ایک صبح کو جب کہ شریف مالکہ مکان کا بستر سمیٹ رہا تھا۔ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں رینگا۔ مسہری کے اوپر بچھا ہوا موٹا نرم گدا، اس کے اوپر خوبصورت چادر اور مخملی کپڑے میں بنا ہوا شاندار لحاف، ان چیزوں نے اس کو تھوڑی دیر کے لئے مبہوت کر دیا۔ "آپا"، وہ مالکہ کی لڑکی سے بولا "کیا اللہ میاں کے یہاں ایسا بستر ہوگا۔" وہ اپنے اس سوال میں اتنا گم تھا کہ وہ یہ بھی نہ سن سکا کہ لڑکی یہ کہتی ہوئی چلی گئی ہے "بیوقوف وہاں تو اس سے بھی اچھے بستر ہوں گے۔"

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو موجودہ زمانے میں سارے لوگ اسی نفسیات میں مبتلا نظر آئیں گے، چھوٹے بڑے امیر غریب، عالم جاہل، سب کے سب دنیا کی دلفریبیوں پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ لذت، دولت، شہرت، عزت، مرتبہ اقتدار، غرض دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا ایک ذرہ بھی اگر کسی کے سامنے آگیا ہے تو وہ اس کی طرف اس طرح دوڑ رہا ہے

گویا زبان حال سے یہ کہہ رہا ہو "خدا کے یہاں بھلا ایسی شان دار چیزیں کہاں ملیں گی، پھر کیوں نہ اسی دنیا میں جو کچھ ملے اس کو حاصل کر لیا جائے۔"

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مذہبی لوگوں کا حال بھی وہی ہے جو دوسرے اہل دنیا کا ہے۔ موجودہ زمانے میں جو دنیوی امکانات ان کے لئے کھلے ہیں ان کی طرف دوڑ بھاگ میں وہ دوسروں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں ——— عہدوں اور مناصب کی دھوم، صدارت ونظامت کے اعزازات، جلسوں اور جلوسوں کی نمائش۔ بین اقوامی کانفرنسوں کے لئے پرواز، ایڈریس اور استقبال کے تماشے، اخبارات کی سرخیوں میں چھپنا اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا شوق ان کو بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی عام دنیا دار کو ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص آخرت پر تقریر کر رہا ہے اس کو بھی آخرت کا یقین نہیں۔ اگر ہے تو بہت کم۔

ایک کامیاب ترین انسان جب موت کے دروازہ پر پہنچتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ دروازہ کے دوسری طرف اس کے لئے مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں

ہوورڈ روبارڈ ہیوز امریکہ کا ایک ممتاز ترین ارب پتی تھا۔ اپریل ۱۹۷۶ میں ایک ہوائی سفر کے دوران اس پر دل کا حملہ ہوا۔ اس نے ہوائی جہاز کو فوراً ہاؤسٹن میں اتار لیا۔ مگر اسپتال پہنچنے سے پہلے وہ ختم ہو چکا تھا۔

اپنے قانون داں باپ سے اس کو ایک ملین ڈالر بطور وراثت ملے تھے۔ مگر اس نے اپنی غیر معمولی تجارتی صلاحیت سے اپنے سرمایہ کو ۲۰۰۰... کرور ڈالر سے بھی زیادہ بڑھا لیا۔ اس کے ہوائی جہاز کا عملہ جو اس کے ساتھ شریک سفر تھا اس نے اس کے آخری لمحات کے بارے میں جو چشم دید تاثرات بیان کئے اس کی بنیاد پر مشہور امریکی آرٹسٹ شرل سالومن نے اس کا خاکہ تیار کیا ہے۔ اس خاکہ میں اس کے سفر حیات کے آخری لمحات کو مصور کیا گیا ہے ——— امریکہ کا کامیاب ترین تاجر اس خاکہ میں وحشت، مایوسی، بے چارگی، ناکامی اور بے یقینی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ امریکی تاجر کی یہ وحشت ناک تصویر اس کیفیت کو مجسم کر رہی ہے جو ایک آدمی کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکا ہو اس کے پیچھے وہ زندگی ہو جس کو وہ چھوڑ چکا اور آگے وہ زندگی ہو جس میں اب وہ ہمیشہ کے لئے داخل ہو جائے گا۔
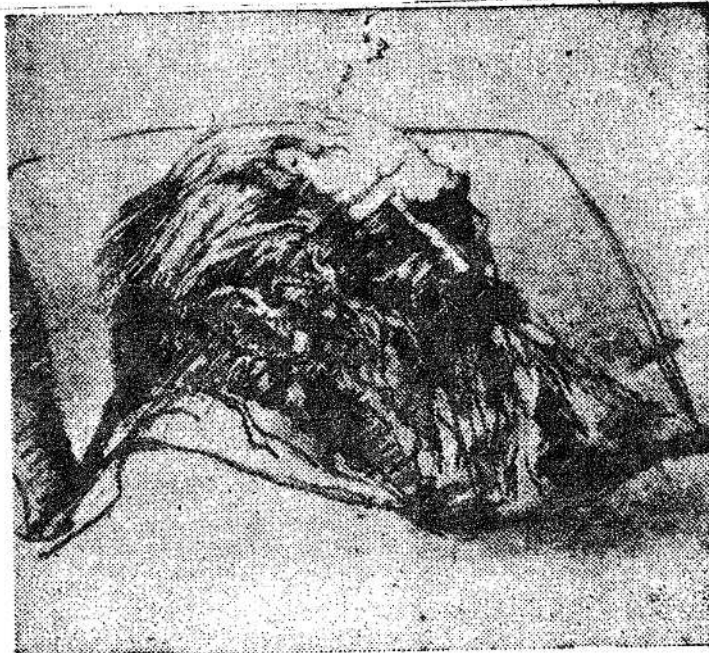
This is how a multi-millionaire looked in the last moments of his life—a sketch of the American legendary figure, Howard Hughes, who died en route from Acapulco (Mexico) to Methodist Hospital, Houston. The sketch was drawn by an artist on the basis of details furnished by the pilots who flew him.

روزہ

غالباً ۱۹۴۳ کی بات ہے۔ گورکھ پور میں ایک بڑے مسلم افسر رہا کرتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں کچھ روز کے لئے ان کے یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے بنگلہ کے سامنے ایک علیحدہ بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روزانہ صبح کو ایک "حافظ صاحب" قرآن بغل میں لئے ہوئے آتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں، پھر واپس چلے جاتے ہیں۔

"یہ کون صاحب ہیں جو روزانہ صبح کو یہاں آتے ہیں" کئی روز تک یہ منظر دیکھنے کے بعد میں نے صاحب خانہ سے پوچھا۔ میرا سوال سن کر پہلے وہ ہنسے۔ اس کے بعد جواب دیا: "بات یہ ہے کہ میں روزہ نہیں رکھ پاتا۔ اس لئے میں نے حافظ صاحب کو مقرر کر دیا ہے کہ وہ رمضان کے پورے مہینے میں میرے یہاں آکر قرآن پاک کی تلاوت کر دیا کریں۔ مہینہ کے ختم پر ان کی کچھ خدمت کروں گا"۔

یہ ایک "بے روزہ دار" کا قصہ تھا۔ اب روزہ داروں کو دیکھئے۔ ایک بار میں نے اذان کی آواز آنے سے پہلے گھڑی دیکھ کر افطار کر لیا۔ کئی لوگ سنجیدگی سے اس شبہ میں پڑ گئے کہ میرا روزہ نہیں ہوا۔ آج کل کے روزہ داروں کا حال یہ ہے کہ وہ اس کا سخت اہتمام کریں گے کہ طلوع سحر سے کچھ منٹ پہلے کھانا پینا بند کر دیں اور غروب آفتاب کے کچھ منٹ بعد افطار شروع کریں۔ اس کا نام انھوں نے "احتیاط" رکھا ہے۔ ایک طرف اوقاتِ روزہ میں احتیاط کا یہ عالم کہ سحری میں تعجیل اور افطار میں تاخیر کی حد تک اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح طور پر سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت اس وقت تک خیر پر رہے گی جب تک وہ افطار میں تعجیل (جلدی) کرتی رہے گی۔ دوسری طرف مقاصد روزہ میں بے احتیاطی کا یہ حال ہے کہ وہ اس کو ضروری نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھ کر کسی کی برائی نہ کریں، کسی سے جھگڑا نہ کریں، منھ سے جھوٹ بات نہ نکالیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بات کرے تو اس کا روزہ، روزہ نہیں۔ اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ کوئی روزہ دار کسی مسلمان کی غیبت کرے تو گویا اس نے خدا کی حلال کی ہوئی چیز سے روزہ رکھا اور اس کی حرام کی ہوئی چیز سے افطار کر لیا۔

یہ دونوں واقعات بظاہر ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ایک جگہ روزہ داری ہے، دوسری جگہ بے روزہ داری۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو دونوں کی شعوری سطح ایک نظر آئے گی۔ دونوں عبادت یا روزہ کو ایک قسم کا رسمی عمل سمجھ رہے ہیں نہ کہ ایک ایسا عمل جو انسان کی اندرونی گہرائیوں سے نکلتا ہے، جو اس کے پورے وجود کا نمائندہ ہوتا ہے۔

عبادت کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ ایک زندہ عمل ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ محض ایک رسم ہو۔ زندہ عمل آدمی کے پورے وجود سے نکلتا ہے۔ وہ اس کی مکمل ہستی کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس رسم کی حیثیت محض ایک بے روح خارجی عمل کی ہوتی ہے۔ آدمی قلب و روح کو اس میں شامل کئے بغیر اوپری طور پر اسے انجام دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر تنہائیوں میں اللہ کو یاد کر کے رونا ایک عبادت ہے جب کہ اپنے دنیوی دھندوں میں مشغول رہتے ہوئے تسبیح کے دانوں پر "اللہ اللہ" شمار کرنا محض ایک رسم ہے۔ تنہائی میں مومن کی آنکھ سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ اس کی پوری ہستی کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ جبکہ لفظ "اللہ" کو شمار کرنے والا صرف یہ کرتا ہے کہ پلاسٹک کے دانوں کو مقررہ تعداد میں دھاگے میں پرو لیتا ہے اور اپنے مشاغل میں مصروف رہتے ہوئے محض انگلیوں کی حرکت کے ذریعہ اس کو گنتا رہتا ہے۔ زندہ عمل میں آدمی اور اس کے عمل کے درمیان گہرا نفسیاتی ربط ہوتا ہے جب کہ رسم میں دونوں کے درمیان اس قسم کا کوئی ربط نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں روزہ کی حیثیت ایک قسم کی سالانہ رسم کی ہوگئی ہے۔ لوگوں کی اصل زندگی بدستور اپنے ڈھرے پر چلتی رہتی ہے۔ روزہ کا زمانہ آتا ہے تو وہ بس ہجری کیلنڈر کے نویں ماہ میں داخل ہوتا ہے۔ لوگوں کی زندگیوں میں داخل نہیں ہوتا۔ روزہ رکھ کر نہ لوگوں کے دل نرم پڑتے۔ نہ ان کے اندر عجز پیدا ہوتا، نہ جائز اور ناجائز کے معاملہ میں ان کی قوت شامہ میں کوئی اضافہ ہوتا۔ ان کے نزدیک روزہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک خاص وقت سے خاص وقت تک کھانا پینا بند رکھا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس طرح بھوکے رہنے سے خدا خوش ہو جائے گا ——— ایسی حالت میں ایک بے روزہ دار کیوں نہ سوچے کہ جب خدا کو خوش کرنے کے لئے کچھ رسم ہی ادا کرنی ہے تو جیسا روزہ کی رسم ویسا تلاوت کی رسم — ایک رسم نہ کی، دوسری رسم کر لی۔ خدا جیسے اس رسم سے خوش ہوتا ہے، اسی طرح وہ دوسری رسم سے بھی خوش ہو جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ روزہ محض ایک خارجی رسم نہیں۔ بلکہ وہ ایک باطنی عمل ہے۔ وہ مومن کی نفسیاتی حالت کا ایک جسمانی اظہار ہے۔ مومن کا مطلب ہے ایک ایسا شخص جو دنیا کی زندگی میں برائیوں سے بچ کر رہے۔ "جو کرنے اور نہ کرنے" کے بارے میں خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کی پابندی کرے۔ روزہ اسی قسم کی پابند زندگی کی مشق ہے۔ روزہ میں کھانا پینا چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو روز مرّہ زندگی میں "یہ کرو اور وہ نہ کرو" کے ایک لازمی کورس سے گزار کر اس کو سبق دیا جائے کہ اسی طرح تم کو پوری زندگی گزارنی ہے۔ اسی طرح ساری عمر کے لئے تم کو "روزہ دار" بن جانا ہے جب کہ تم خود اپنے ارادہ سے ایک طرح کی زندگی کو چھوڑ دو اور دوسری طرح کی زندگی کو بالقصد اختیار کر لو۔ روزہ کے مہینے کی پابند زندگی دراصل پورے سال اور ساری عمر کے لئے پابند زندگی کی ایک علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے سارے معاملات میں "روزہ داری" کے اسی طریقے پر عمل کرے جو اس نے رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کے معاملہ میں کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو، حدیث کے الفاظ میں "اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ کوئی شخص محض اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"۔

اگر روزہ دار لوگ اپنے عمل سے حقیقی روزہ داری کا نمونہ پیش کریں تو غیر روزہ داروں کو ہمت ہی نہیں پڑے گی کہ وہ سوچیں کہ اپنے روزہ کی تلافی کے لئے کسی حافظ صاحب کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں یہ عمل بالکل مضحکہ خیز دکھائی دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ روزہ کی یہ بے قدری روزہ داروں نے کی ہے نہ کہ بے روزہ داروں نے۔ بے روزہ دار تو اسی کو روزہ سمجھیں گے جس کا نمونہ روزہ دار دکھا رہے ہوں۔

زمانہ کا فرق کہاں سے کہاں پہنچا ہے

ناوابستہ ملکوں کی کانفرنس جو کولمبو میں اگست ۱۹۷۶ کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی اس کی خبروں میں سے ایک خبر یہ تھی کہ ۳۵ مسلم ملکوں کے سربراہ اور ان کے ساتھی جو اس کانفرنس میں شریک ہوئے انھوں نے ۱۳ اگست کو جمعہ کی نماز مقامی جامع مسجد میں ادا کی۔ اس کے انتظام کے لئے جو کمیٹی بنی، اس کے صدر الحاج بدیع الدین تھے جو سری لنکا کی حکومت میں ایک وزیر ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کے اس علاقہ کی نمائندگی کرنے والی کوئی کانفرنس اگر پچاس برس پہلے "کولمبو" میں ہوتی تو ہم اس قسم کی خبر اخبار میں نہ پڑھتے۔ کیونکہ اس وقت ان "۳۵" اسلامی ملکوں کے نمائندے مسلمان سربراہ نہ ہوتے، بلکہ یورپی ملکوں کے گورنر اور وائسرائے ہوتے۔ موجودہ زمانہ نے اسلام کو زندہ کرنے کے بہت سے نئے امکانات کھول دیئے ہیں۔ مگر شاید ابھی تک لوگوں کو اس کی خبر نہیں۔

اسلام کی عظمتیں اسلام کی چوکیدار ہیں

دہلی کی جامع مسجد، شاہجہاں کی ایک حیرت انگیز یادگار ہے۔ یہ عظیم مسجد چھ سال (۵۶-۱۶۵۰) میں بن کر تیار ہوئی۔ چھ ہزار کاریگروں اور مزدوروں نے مسلسل اس میں کام کیا۔ اور اس کی تعمیر پر دس لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ یہ تین سو برس پہلے کی بات ہے جب کہ ایک مستری کی اجرت دو پیسے اور مزدور کی ایک پیسہ یومیہ ہوتی تھی۔ نیز مسجد کے قیمتی پتھر اور عمارتی سامان راجاؤں کی طرف سے مفت پیش کئے گئے تھے۔ اس مقدس عمارت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہائی سادہ ہونے کے باوجود انتہائی پرکشش ہے۔ تاج محل نے اپنے رومانوی پہلو کی وجہ سے غیر معمولی شہرت پائی۔ مگر متنا سب شکوہ اور لطیف حسن جس طرح جامع مسجد کے سرخ و سپید پتھروں میں ڈھل گئے ہیں، اس کی کوئی دوسری مثال زمین پر مشکل سے ملے گی۔

شاہجہاں کے زمانے میں جامع مسجد کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا۔ جامع مسجد اور لال قلعہ اور مینا بازار کا مجموعہ اس زمانے میں دنیا کے چند انتہائی پرکشش مقامات میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ مگر ۱۸۵۷ کے انقلاب کے بعد وہ گندگی کا علاقہ بنتا چلا گیا۔ مسجد کے چاروں طرف دکانوں کے لاتعداد گھروندے کھڑے ہو گئے اور اس کی عالی شان سیڑھیاں گداگروں کا اڈا بن گئیں۔ مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۱-۱۸۷۸) کو ایک بار ایک پیشہ ور مصور نے ایک روغنی تصویر فروخت کے لئے پیش کی۔ یہ جامع مسجد دہلی کی تصویر تھی۔ اس کی سیڑھیوں پر ایک بھکاری عورت کو اپنی دو بچیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے دکھایا گیا تھا جامع مسجد کی سیڑھیوں کے لئے یہ اتنا عام منظر تھا کہ محمد علی اس کی تردید نہ کر سکے۔ البتہ اس کو بامعنی بنانے کے لئے انھوں نے کہا: میں تمھاری تصویر کو خرید لوں گا، تم تصویر کے نیچے یہ جملہ لکھ دو:

Her Fathers Built It

اس کے بڑکھوں نے اسے بنایا تھا۔

مسجد کے چاروں طرف جو تعمیری گھروندے کھڑے ہوئے تھے ان کو ہٹانے کا کام ۲۲ نومبر ۱۹۷۵ کو شروع ہوا تھا۔ ساڑھے سات سو دکانوں کے ہٹانے کے بعد اب ایسا نظر آتا ہے جیسے کوئی سرخ پہاڑ تھا جس کو ملبہ نے ڈھک لیا تھا اور اب اس کو اچانک کھول دیا گیا۔ بلند چٹان پر بنی ہوئی مسجد اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آ گئی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے چاروں طرف عظمت کے چوکیدار کھڑے ہو گئے ہیں" میرے ایک دوست نے مسجد کے نئے منظر کو دیکھ کر کہا "ایک عظیم وجود خود ہی اپنا چوکیدار ہوتا ہے، اگر اس کو پستیوں سے ڈھانک نہ دیا جائے۔"

مجھے خیال آیا کہ اسلام کی عظمت کو بھی اسی طرح اس کے پیروؤں نے اپنی پستیوں سے ڈھانک رکھا ہے۔ اگر ہم اپنی پستیوں کے نشانات کو اس کے گرد و پیش سے ہٹا دیں تو معلوم ہوگا کہ ـــــ اسلام کی عظمتیں خود ہی اسلام کی چوکیدار ہیں۔ اس کو اپنی عظمت کا منارہ کھڑا کرنے کے لئے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔

۱۹۴۷ کے ہنگامہ کے بعد دہلی کے مسلمان جب دوبارہ آباد ہوئے تو ان کا رجحان زیادہ سے زیادہ جامع مسجد کے گرد جگہ حاصل کرنے کا تھا۔ یہاں وہ اپنے کو ایک قسم کی پناہ کے اندر

محسوس کرتے تھے۔ مگر یہ کوئی صحت مند رجحان نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کا راز پھیلنے میں ہے نہ کہ سمٹنے میں۔ حکومت کے تازہ عمل نے مسلمانوں کو دوبارہ جد وجہد کے پھیلے ہوئے میدان کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ ایک قسم کی مہمیز ہے جو ان کے لئے ترقی اور عروج کا ایک نیا وسیع تر راستہ کھول دے گی۔ اس معاملہ میں حکومت کی تعمیر پسندی کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ جامع مسجد سے جن دکانداروں کو ہٹایا گیا ہے، ان کو نئی زیادہ بہتر دکانیں حکومت کی طرف سے بنا کر دے دی گئی ہیں۔ پہلے ان کی دکانیں اگر کھوکھوں میں تھیں تو اب وہ سرخ پتھروں سے بنے ہوئے "مینا بازار" میں اپنی دکانیں سجائے ہوئے ہیں۔ شاہجہاں کا دور نئی شکل میں دوبارہ واپس آگیا ہے۔

جامع مسجد کے علاقہ کے لئے حکومت کا یہ منصوبہ اچانک طور پر پیدا نہیں ہوا ہے۔ تقریباً ۲۰ برس پہلے جامع مسجد کی ترقیاتی اسکیم بن چکی تھی۔ اس اسکیم کا محرک دراصل ہندستان میں سیاحت کو ترقی دینا ہے۔ سیاحت موجودہ زمانہ میں ایک انڈسٹری بن گئی ہے۔ ۱۹۷۴ میں عالمی سیاحوں کی تعداد ۲۱۰ ملین تھی۔ آج تمام ممالک اپنے تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کو ترقی دے رہے ہیں تاکہ وہ بیرونی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچ سکیں جو اپنے ساتھ بیرونی دولت کی بہت بڑی مقدار لے آتے ہیں۔ پچھلے برسوں میں "پٹرو ڈالر" کے ظہور نے سیاحت کے عالمی نقشہ پر عربوں کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ ہندوستان اب تک سیاحت کی انڈسٹری میں پیچھے رہا ہے۔ ۱۹۷۴ میں ۲۳۲۰۰ کروڑ روپے سیاحوں کے ذریعے گردش میں آئے۔ مگر ان کا ایک فی صد سے بھی کم حصہ ہندستان پہنچا۔ عالمی سیاحوں کی ۸۰ فی صد تعداد صرف ۲۰ ملکوں میں جاتی ہے۔ حالاں کہ اس عظیم ملک میں وہ سب کچھ ہے جو اس کو عالمی سیاحت کا مرکز بنانے کے لئے کافی ہے۔ خاص طور پر مغربی ایشیا کے مسلم ملکوں کے سیاح اور اس علاقے سے آنے والی اہم شخصیتوں کو دکھانے کے لئے ہمارے یہاں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ سامان موجود ہے۔ ان میں بھی تاج محل کے بعد شاہجہانی مسجد اور لال قلعہ اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے اہم ترین درجہ رکھتے ہیں۔

حکومت کے اس اقدام نے اس علاقہ کو اچانک مقامی اہمیت کے ایک بازار سے اٹھا کر بین اقوامی اہمیت کا بازار بنا دیا ہے۔ یہ علاقہ عنقریب ہندستان میں سیاحوں کی آمد ورفت کا سب سے بڑا مرکز بن جائے گا۔ یہاں سفراء اور وزراء اور حکومتوں کے سربراہ آئیں گے۔ اہم شخصیتوں کے پروگرام میں اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگی۔ مسلمان اس راز کو جان لیں تو موجودہ "توڑ پھوڑ" کو اپنے لئے عظیم تعمیر نو کی بنیاد بنا سکتے ہیں۔ اس علاقہ کے دکان دار اگر اپنی دکانوں کو بین اقوامی معیار کے مطابق ترقی دیں اور بیرونی مہمانوں کی دل چسپی کی چیزیں فروخت کے لئے رکھیں تو وہ عالمی سطح پر اپنے خریدار پاسکتے ہیں۔

آخری اہم ترین بات یہ ہے کہ اس علاقہ میں ایک "اسلام بھون" قائم کیا جائے۔ یہاں اسلام کی تاریخی چیزیں رکھی جائیں اور ملکی اور دیگر قوموں کی زبانوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کیا جائے۔ یہاں آنے والے سیاح اور بڑی بڑی شخصیتیں اس سے خصوصی دل چسپی لیں گی۔ اور وہ نہ صرف تجارتی حیثیت سے کامیاب ہوگا بلکہ اسلام کی بین اقوامی اشاعت کا ایک اہم مرکز بن جائے گا۔

جامع مسجد کا نیا منظر پیدا ہونے کے بعد خود دہلی کے غیر مسلم اور ملکی سیاح بڑی تعداد میں یہاں آنے لگے ہیں۔ ان

جامع مسجد دہلی کی نئی تعمیر نے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے نیا مستقبل کھول دیا ہے

یہاں اسلام کی

بین اقوامی اشاعت کا ادارہ

قائم کیا جا سکتا ہے

لوگوں کی یہ آمدان کے درمیان اسلام کے تعارف کا بہت قیمتی ذریعہ بن سکتی ہے۔ اگر جامع مسجد کے قریب کوئی اسلام بھون قائم ہو، وہاں ملک کی مختلف زبانوں میں لٹریچر ہو اور ہندی اور دوسری زبانوں کے جاننے والے لوگ وہاں ان سے ملاقات اور گفتگو کے لئے موجود ہوں تو وہ کثرت سے وہاں آئیں گے اور اسلام کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ مسلمانوں کی غلط سیاست نے ان کے لئے جو مشکلات پیدا کی ہیں ان کو دور کرنے کی اس سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ جامع مسجد کے علاقہ کو حکومت جس طرح کروڑوں روپیہ صرف کر کے خوبصورت بنا رہی ہے۔ اس میں ہمارے لئے ایک زبردست روشنی ہے۔ "مسجد" مسلمانوں کا ایک خالص مذہبی نشان ہے۔ اس کے باوجود اس میں دلچسپی لینے کے لئے کوئی تعصب حائل نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس ملک کے لوگوں میں کس قدر رواداری ہے وہ اگر کسی چیز کو پسند کر لیں تو ہر قسم کے تعصب سے بالا ہو کر اس میں اپنی بہترین قوت صرف کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامع مسجد کے معاملہ کو بے تعصبی کا معاملہ بنا کر حکومت نے اسلام کے معاملہ کو بے تعصبی کا معاملہ بنا دیا ہے، اس واقعہ نے بہترین طور پر وہ فضا پیدا کر دی ہے جس میں اسلام کے تعارف و اشاعت کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ کسی مزاحمت کے بغیر کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ مواقع سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہمارے اندر موجود ہو۔

○

حضرت یحییٰ بن زکریا (متوفی ۳۰ء) بائبل کے الفاظ میں، بیابان میں پکارنے والے کی آواز تھے۔ مگر آج پریس کا زمانہ ہے۔ آج پیغمبرانہ دعوت کو پھیلانے کے لئے ضروری ہے کہ پریس کی طاقت کو استعمال کیا جائے۔

الرسالہ کوئی تجارتی پرچہ نہیں، یہ تعمیر ملت اور احیائے اسلام کی اشاعتی مہم ہے۔ اس کے زندہ رہنے اور موثر بننے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ آپ اس کو اپنا کام سمجھیں اور اس میں بڑھ چڑھ کر تعاون فرمائیں۔

الرسالہ کا صرف عام چندہ اس کی زندگی کا ضامن نہیں بن سکتا۔ رائج الوقت دوسرے ذریعے بھی اس کی مالی تقویت کے لئے اختیار کرنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں اس کی زندگی کی واحد صورت یہ ہے کہ آپ اس کی خصوصی خریداری قبول فرمائیں۔ خصوصی خریداری کے لئے کم سے کم ایک سو ایک روپیہ سالانہ (ہندستان کے لئے) رکھا گیا ہے۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

ملت اسلام کے مستقبل کو بدلنے کے لئے ایک نئی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ الرسالہ اسی جدوجہد کا ایک عنوان ہے۔ اگر اس مہم کو آپ کا خصوصی تعاون مل گیا تو ہو سکتا ہے کہ اس آغاز سے وہ انجام ظہور میں آئے جس کا صدیوں سے زمین و آسمان کو انتظار ہے۔

○

نئے حالات نے مذہب کو پھیلانے کا نیا دروازہ کھول دیا ہے

سفر کی سہولتوں نے موجودہ زمانہ میں بین اقوامی سیاحت کو ایک مستقل انڈسٹری بنا دیا ہے۔ آج جو لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتے ہیں، ان میں بڑی تعداد سیاحوں کی ہوتی ہے۔ ہندستان میں پچھلے چند برسوں کے اعداد و شمار کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے اندر آنے والے سیاحوں میں تہائی کی تعداد میں وہ لوگ تھے جن کی عمریں ۱۷ سال اور ۳۰ سال کے درمیان تھیں۔ ان میں بھی ۲۷ فی صد وہ نوجوان تھے جو اپنے اپنے ملکوں میں زیر تعلیم ہیں یہ سیاحت کی دنیا میں ایک نئی چیز ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس قسم کی سیاحت کے لئے زیادہ تر بوڑھے لوگ نکلا کرتے تھے۔

سیاحوں کی فہرست میں نوجوانوں کا اضافہ بہت معنی خیز ہے۔ جوانی کا زمانہ جوش و خروش کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں زندگی امنگوں اور حوصلوں سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان، قدیم سیاحوں سے مختلف ہیں اور کچھ نئی چیزوں کے طالب ہیں۔ قدیم سیاح آرام دہ ہوٹل، ایرکنڈیشنڈ کار اور کھانے پینے کے عمدہ انتظام کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ نوجوان سیاح ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے وہ اوسط درجہ کے انتظام پر بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ آرام اور فیشن کی تلاش سے زیادہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لئے ڈاکومنٹری فلم، کلچر اور تعلیم یافتہ گائڈ کا انتظام ہو، جو ان کو ملک کی تہذیبی وراثت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات دے سکے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک اخبار نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا تھا: "یہ نئے قسم کے سیاح محض تماش بین نہیں ہیں جو وقت گزاری کی خاطر یہاں آتے ہیں۔ ان کے اندر علم کی پیاس ہے۔ وہ ہندوستان کے آرٹ اور کلچر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں"۔

انڈین اکسپرس، ۸ مارچ ۱۹۷۲

یہ دراصل اس عام رو کا ایک نمونہ ہے جو ساری دنیا میں نئی نسل کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ آج کی نئی نسل، خاص طور پر ترقی یافتہ ملکوں کی نئی نسل، اپنے ماحول سے غیر مطمئن ہے۔ یہ ماحول اس کو مادی مواقع دیتا ہے۔ مگر اس کے ذہنی اور روحانی سوالات کا جواب اس میں نہیں ملتا۔ چنانچہ جدید دنیا میں عام طور پر ماضی کی طرف دیکھنے کا ذہن ابھر رہا ہے جب کہ انسانی سماج مشین کی پیدا کردہ الجھنوں سے پاک تھا۔ آج کا انسان یہ سمجھتا ہے کہ جس سوال کا جواب حال میں موجود نہیں، اس کا جواب شاید ماضی کے خزانہ میں اسے مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں مغربی سیاحوں کی آمد بڑھ رہی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مشرق میں وہ ماضی ابھی تک محفوظ ہے جو مغرب میں بڑی حد تک ضائع ہو چکا ہے۔

اس صورت حال نے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ مزید یہ کہ بین اقوامی سیاحی نے مدعو کو خود داعی کے پاس پہنچا دیا ہے۔ جن لوگوں کو پانے کے لئے ہمیں سمندر پار کا سفر کرنا پڑتا وہ خود ہمارے قریب آکر کھڑے ہو گئے ہیں۔ مگر داعیوں کا حال یہ ہے کہ مسلم تاریخی مقامات پر آنے والے سیاحوں کو وہ اپنے لئے تجارت کا مال سمجھتے ہیں، نہ کہ دعوت کا موضوع۔ دہلی کی جامع مسجد میں نماز کے اوقات میں ان کے لئے داخلہ ممنوع ہے۔ حالاں کہ اس وسیع مسجد میں اگر نماز کے وقت غیر مسلم آئیں اور قرآن کے بتائے ہوئے طریق عبادت کو دیکھیں تو یہ ان کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے ہم معنی ہوگا اور اس حکم خداوندی کی تعمیل ہوگی جو سورہ توبہ آیت ۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

نماز سے آغاز

دو برس پہلے کی بات ہے، میں اپنی کتاب "الاسلام" کی ترتیب کے دوران ایک سوال سے دوچار تھا۔ "موجودہ زمانہ تجربوں اور مشاہدوں کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان اگر مجھ سے پوچھے کہ کیا اسلام کی صداقت کو ہم تجرباتی طور پر جان سکتے ہیں، تو میرا جواب کیا ہوگا" اسی اثنا میں ۱۳ اور ۱۴ جولائی ۱۹۷۴ کی درمیانی شب کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا کہ میں کچھ غیر مسلموں کے ساتھ ہوں اور ان کو اسلام کی باتیں بتا رہا ہوں۔ یہ غالباً یورپ کے کچھ لوگ تھے اور مجھ سے ٹھیک یہی سوال کر رہے تھے۔ عجیب بات ہے کہ وہ سوال جس کو میں حالت بیداری میں حل نہ کر سکا تھا، اللہ تعالیٰ نے حالت خواب میں اس کو کھول دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس سوال کے جواب میں ان سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں: "ہاں اسلام کی تجرباتی آزمائش ممکن ہے اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ نماز کا تجربہ کریں" مخاطب کی رعایت سے خواب کی یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میری نیند کھلی تو اپنا ایک جملہ مجھے لفظ بہ لفظ یاد تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا:

Without being a Muslim, you can experience Namaz

(مسلمان نہ ہوتے ہوئے آپ نماز کا تجربہ کر سکتے ہیں) جہاں تک یاد آتا ہے، اس کے بعد ان لوگوں نے وضو کیا اور میرے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کا یہ "تجربہ" ان کے لئے اتنا مؤثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

تاریخ میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ صرف نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہند جگر خوار کے اسلام سے متاثر ہونے کا ابتدائی سبب نماز ہی تھی۔ مسلمان جب مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو انھوں نے وہاں ظلم اور گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ مسجد میں جا کر اللہ کے سامنے اپنے عجز اور بندگی کا اقرار کیا۔ ابن مندہ نے روایت کیا ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابوسفیان سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ ابوسفیان نے کہا، تم تو ابھی کل تک اسلام کی سخت مخالف تھیں۔ انھوں نے جواب دیا ہاں، مگر رات جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے ذہن کو بالکل بدل دیا ہے:

واللہ ما رأیت اللہ تعالیٰ عبد حق عبادتہ فی ھذا المسجد قبل اللیلۃ، واللہ ان باتوا الا مصلین قیاما و رکوعا و سجودا

خدا کی قسم، آج کی رات سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس مسجد میں خدا کی عبادت اس طرح کی گئی ہو جیسا کہ اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ ساری رات نماز پڑھتے رہے۔ انھوں نے قیام اور رکوع اور سجود میں رات گزار دی۔

افریقہ کی تاریخ کا ایک مبصر لکھتا ہے:

"وسط افریقہ میں اسلام کی اشاعت بہت بڑی حد تک سیاحوں اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا معجزہ جس سے افریقہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، نماز تھا۔ جہاں یہ لوگ ایک امام کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہوئے اور ان کے چہروں سے خدا کا خوف ظاہر ہوا دیکھنے والے گھل کر رہ گئے۔ لوگ ایک طرف اپنی ذلیل بت پرستی پر نادم ہوئے، دوسری طرف اسلامی عبادت نے ان کو اپنی طرف کھینچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف نماز نے وسط افریقہ کی اکثر آبادی کو اسلام میں داخل کر دیا"

Winwood Reade, Martyrdom of Man, P.32

شاہجہاں کے زمانے میں منگولوں سے مغل سلطنت کا مقابلہ پیش آیا۔ اورنگ زیب اس وقت شہزادہ تھا۔ اس کو مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے منگولوں کو سنکیانگ تک دھکیل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت اورنگ زیب اور جے سنگھ کی فوجیں سنکیانگ کے صحرا میں منگولوں کا مقابلہ کررہی تھیں۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب گھوڑے سے اتر گیا۔ اور میدان جنگ میں رومال بچھا کر نماز ادا کرنے لگا۔ منگولوں نے دیکھا کہ بادشاہ "ڈنڈ بیٹھک" کی طرح کوئی عمل کررہا ہے۔ انھیں اس عمل پر سخت حیرت ہوئی۔ نماز کے آداب کو قریب سے دیکھنے کے لئے انھوں نے جنگ روک دی اور اورنگ زیب کا محاصرہ کرلیا۔ وہ سکون کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور منگول چاروں طرف اس کو گھیرے ہوئے حیرت کے ساتھ اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے تھے جب بادشاہ نے سلام پھیرا تو منگولوں نے پوچھا کہ یہ آپ کیا کررہے تھے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا: "میں اس خدا کی عبادت کررہا تھا جو سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مہربان ہے"۔

بادشاہ کا یہ جواب سن کر منگول کانپ اٹھے۔ ان کا حوصلہ پست ہوگیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیئے کہ ایسے بہادر انسان کو زیر کرنا ممکن نہیں۔ یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے۔

محمد حسنین ہیکل (سابق ایڈیٹر الاہرام) نے لکھا ہے کہ جمال عبدالناصر جب پہلی بار روس گئے تو اس وقت کے روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے گفتگو کے دوران نماز سے بڑی دل چسپی کا اظہار کیا۔ یہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے:

"خروشچوف کو مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب خروشچوف کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد صدر ناصر ظہر کی نماز کے لئے ماسکو کی مسجد جانے لگے تو خروشچوف نے سوالوں کی بھرمار کردی۔ ناصر جتنی دیر وضو کرتے رہے، خرشچوف بذات خود تولیہ لئے کھڑا رہا۔ اس نے بڑی عقیدت واحترام کا مظاہرہ کیا"۔

علم الانسان پر جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ معبود کی پرستش کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اسے ختم نہیں کرسکتی۔ نماز اسی فطری جذبہ کے اظہار کا فطری طریقہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے آداب اور طریقوں میں یہ فطری تقاضا اس طرح سمیٹ دیا گیا ہے کہ نماز میں اور انسان میں خاص مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ نماز انسانی فطرت کی عکاس بن گئی ہے۔ جون ۱۹۷۶ء میں ایک بار مجھے ایک غیر مسلم کے مکان پر نماز ادا کرنے کا موقع ملا۔ ہم دو آدمی تھے۔ جب تک ہم لوگ نماز پڑھتے رہے، چھ افراد کا پورا خاندان دم بخود ہوکر ہم کو دیکھتا رہا۔ نماز سے فراغت کے بعد صاحب خانہ نے کہا: "آپ کی نماز کو دیکھ کر میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی اس میں شریک ہوجاؤں"۔ اس قسم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں کئی بار پیش آیا ہے۔

ہماری یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے آغاز کی عملی شکل کیا ہو۔ دین کو ان کے لئے بحث کا موضوع کس طرح بنایا جائے۔ موجودہ حالات میں اس کی ایک قابل عمل شکل نماز نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نماز کی "اٹھ بیٹھ" بعض لوگوں کو عجیب سی چیز معلوم ہوگی۔ جیسا کہ مکہ میں ابوطالب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے صاحب زادے علی بن ابی طالب ابتداءً نماز ہی کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوئے تھے، اور پھر اسلام کے سب سے بڑے جاں باز ثابت ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری اقوام تک دین کو پہنچانے کے لئے نماز نہایت کامیاب ذریعہ بن سکتی ہے۔ فطری کشش تو اس کے اندر ہمیشہ سے تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے تجرباتی اور مشاہداتی مزاج نے اس کے اندر ایک "سائنسی" اہمیت پیدا کردی ہے۔ آج کا انسان چاہتا ہے کہ کسی بات کو ماننے سے پہلے اس کو عملی شکل میں جانے، وہ اس کا ذاتی تجربہ کرسکے۔ نماز اس ضرورت کو کمال درجہ

میں پورا کرتی ہے۔ جب ایک شخص نماز میں مشغول ہو تو وہ حیرت انگیز طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ خود اس کی اندرونی مانگ کا جواب ہے۔ نماز کے مختلف اعمال میں خود اس کے اپنے روحانی تقاضے پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی پوری ہستی نماز میں اس طرح شامل ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اور حقیقت اعلیٰ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص دور سے صرف نماز کا مشاہدہ کر رہا ہو، وہ بھی اس کی سادگی، اس کی عظمت اور انسانی وجود کے ساتھ اس کی مطابقت پر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کھلم کھلا محسوس کرنے لگتا ہے کہ معبود کی پرستش کا اس سے بہتر کوئی طریقہ ممکن نہیں۔

جہاں تک نجات آخرت کا سوال ہے آدمی کے لئے باایمان نمازی ہونا ضروری ہے۔ مگر اس کی کیفیات کو پانے کے لئے رسمی ایمان کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص "اگر وہ سنجیدہ ہو" ایمان لائے بغیر بھی نماز کے مقررہ طریقے میں اپنے آپ کو مشغول کر کے نماز کی کیفیتوں اور لذتوں کا ایک حصہ پا سکتا ہے۔ نماز کا یہ پہلو اس کے اندر ایک دعوتی قدر پیدا کر دیتا ہے۔ مکہ کی تاریخ اس کی عملی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ کیونکہ مکہ میں، اسلام کے ابتدائی دور میں، قرآن کے بعد نماز ہی سب سے زیادہ لوگوں کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ بنی تھی۔

دوسری قوموں میں دین کی اشاعت کے لئے موجودہ زمانے میں ہمیں جو کام کرنے ہیں ان میں سے ایک کام یہ ہے کہ عالمی سطح پر مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی جائے۔ اس تنظیم کا خاص مقصد نماز پڑھنا اور پڑھانا ہو۔ اس کے افراد تمام شہروں میں ہوں اور وہ ہر دن کسی نہ کسی ایسے پارک میں جائیں جہاں غیر مسلم مرد اور عورتیں تفریح کے لئے آتے ہوں۔ وہاں وہ ایک دو گھنٹے اس طرح گزاریں کہ ان کی گفتگو اور اٹھنے بیٹھنے میں مکمل طور پر سنجیدگی کا اظہار ہو۔ ان کے پاس قرآن کا ترجمہ ہو یا ایسی کوئی کتاب ہو جس میں پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے اخلاقی اور ایمانی واقعات درج ہوں۔ وہ آپس میں بیٹھ کر اس کو پڑھیں۔ بالقصد اپنی طرف سے کسی کے اوپر تبلیغ کی کوشش نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی شخص خود سے ان کے حلقۂ درس میں بیٹھنا چاہے تو اس کو عزت کے ساتھ بٹھائیں۔ کوئی سوال کرے تو انتہائی نرمی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا جواب دیں۔ جواب معلوم نہ ہو تو صفائی کے ساتھ کہیں کہ ہمیں اس کا جواب معلوم نہیں۔ ہم تحقیق کر کے اگلے دن آپ کو بتائیں گے۔ ان کے پاس نماز اور دوسری اسلامی تعلیمات کے بارے میں چھوٹے چھوٹے کتابچے مختلف زبانوں میں ہوں جو وہ شائقین کو مفت دے سکیں۔ پارک کے اس پروگرام کا سب سے اہم جزو نماز ہو۔ اس مقصد کے لئے غالباً عصر کی نماز زیادہ موزوں ہوگی۔ سب نوجوان مل کر نماز ادا کریں۔ نماز خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ایسا ہرگز نہ کریں کہ جلدی جلدی پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ چار رکعت نماز میں لگ بھگ ۲۰ منٹ صرف کئے جائیں۔ نماز اس طرح پڑھی جائے گویا ہم فی الواقع اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ کام اگر کچھ برسوں تک مسلسل نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔ مسجدوں میں نماز کی تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ اسی طرح پارکوں میں نماز کی تحریک غیر مسلموں تک دین کا پیغام پہنچانے کے لئے چل پڑے تو ہماری ذمے داری کے دونوں تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ اور دنیا میں اگر خدانخواستہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو آخرت میں انشاء اللہ ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے خلق اللہ کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اور ایک مومن کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہ کام نظم کے ساتھ ہو۔ جو لوگ اس پروگرام میں شریک ہوں وہ باہم مشورہ سے ایک شخص کو "متکلم" مقرر کر لیں۔ وہی شخص کتاب پڑھے اور وہی شخص بوقت ضرورت بولے۔ بقیہ لوگ بالکل خاموش رہیں اور متکلم کے حق میں دل ہی دل میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے اور اس کی زبان سے وہی کلمات نکالے جس میں حق اور خیر ہو۔

A Spiritual Turn To American Life

امریکہ کا صدارتی الیکشن ۲ نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوگا۔
ڈیموکریٹک پارٹی نے اس کے لئے جمی کارٹر کو اپنا نمائندہ چنا ہے۔
ریپبلکن پارٹی اس وقت جس حالت انتشار میں ہے اس کے
پیش نظر اکثر مبصرین کا خیال ہے کہ امریکہ کے ۵۲ ویں صدر
جمی کارٹر ہوں گے۔ یہ امریکہ کی سیاسی تاریخ میں ایک نمایاں
واقعہ ہوگا۔ کیونکہ ۱۸۴۹ کے بعد پہلی بار امریکہ کے جنوبی
علاقہ کا کوئی شخص اقتدار کی کرسی پر بیٹھے گا۔

جمی کارٹر (پیدائش ۱۹۲۴) امریکہ کی جنوبی ریاست
جارجیا کے رہنے والے ہیں۔ چند ماہ پہلے تک باہر کی دنیا میں
انھیں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ان کے مقابلہ میں تقریباً ایک
درجن امیدوار تھے۔ ان میں بعض عالمی شہرت کے مالک ہیں
مثلاً ہیوبرٹ ہمفری۔ ایسی حالت میں جمی کارٹر کی کامیابی
کا راز کیا ہے۔

اس کی وجہ امریکی عوام کی موجودہ نفسیات ہیں۔
۱۹۴۵ میں جاپان کو ایٹم بم سے تباہ کرنے کے بعد امریکہ نے
سمجھ لیا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ مگر ویٹ نام
اور کمبوڈیا کی پسپائی، روس کا متوازی ایٹمی طاقت کی
حیثیت سے ابھرنا۔ سمندروں پر امریکی بالادستی کا خاتمہ،
عرب۔ اسرائیل قضیہ میں یک طرفہ کارروائی کے مواقع ختم
ہو جانا۔ ایسے واقعات تھے جنھوں نے امریکی باشندوں
کے احساس برتری کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح پٹرول اور خام
مواد میں امریکہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار، مادی فراوانی
کے باوجود ٹکنالوجی کے پیدا کردہ سنگین مسائل اور اس طرح
کی دوسری چیزیں ہیں جنھوں نے امریکی شہریوں کے اس پر فخر
یقین کو کھو دیا ہے جس سے جنگ عظیم ثانی کے بعد ہر امریکی
سرشار نظر آتا تھا۔

جمی کارٹر ذہنی یا عملی اعتبار سے کسی غیر معمولی
شخصیت کے مالک نہیں ہیں۔ ان کی اصل خصوصیت یہ ہے
کہ وہ انسانی حقوق اور قدیم اقدار کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی
تقریروں میں ایک قسم کا اخلاقی اور مذہبی رنگ پایا جاتا ہے۔
وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور بائبل کے حوالے دیتے ہیں۔ حال
میں ایک تقریر میں انھوں نے کہا:

There is more - much more - to this nation than money, property and inherited advantage. Materially, we are a great and powerful nation and proud of it. But it is our principles and our spirit that we value above all.

کچھ چیزیں ہیں جو امریکی قوم کے لئے دولت، جائداد، پیدائشی
مواقع سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ مادی اعتبار سے ہم ایک عظیم
اور طاقت ور قوم ہیں اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ مگر ہمارے اصول
اور ہماری اسپرٹ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔
(اسٹیٹسمین ۱۷ جولائی ۱۹۷۶ء)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمی کارٹر امریکی صدر بننے کے
بعد اپنے ملک میں اخلاقی اور مذہبی حکومت قائم کر دیں گے۔
یقینی طور پر ایسا کوئی سیاسی معجزہ پیش آنے والا نہیں ہے۔
تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور جدید کی سب سے زیادہ
ترقی یافتہ قوم کو اس کے مادی سفر نے بالآخر کہاں پہنچایا ہے
جمی کارٹر جس روحانی احیاء

(Spiritual Rennaissance)

کا نام لیتے ہیں، وہ ان کے اپنے صدارتی عزائم سے زیادہ امریکی
ووٹروں کی موجودہ نفسیات کو بتاتی ہے۔ اس نفسیاتی طلب
کا جواب فراہم کرنا کسی سیاسی لیڈر کے لئے ممکن نہیں۔ اس
کو تو کوئی خدا پرستانہ تحریک ہی انجام دے سکتی ہے اور وہی
اسے انجام دے گی۔ خواہ آج یا آج کے کئی سو برس بعد۔

آج ساری دنیا میں ایک نیا عمل جاری ہے ــــ
دو سو سال کی عارضی مادہ پرستی کے بعد دوبارہ مذہب
اور روحانیت کی طرف واپسی۔

تعلیمات اسلامی کا ایک ادارہ قائم کرنے کی ضرورت

سر آرتھر کیتھ (۱۸۶۶ - ۱۹۵۵) نے مصر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مصر کو مسلمانوں کی تلوار نے فتح نہیں کیا بلکہ قرآن نے فتح کیا"۔ یہی بات ایشیا اور افریقہ کے اس پورے خطہ کے لیے صحیح ہے جس کو آج ہم اسلامی دنیا کے نام سے جانتے ہیں۔ ایسا کیوں کر ہوا کہ یہ ساری قومیں نہ صرف اپنا مذہب بلکہ زبان تک بدل کر اسلامی برادری میں شامل ہو جائیں۔ جواب یہ ہے کہ مدرسوں کے ذریعہ۔ دور اوّل کے مسلمان عرب سے نکل کر اطراف کے تمام ملکوں میں پھیل گئے۔ انھوں نے اپنی اسلامی مہم کے مرکز کے طور پر جگہ جگہ اسلامی مدرسے قائم کئے۔ ان مدرسوں میں لوگوں کو عربی زبان سکھائی جاتی تھی اور قرآن و حدیث پڑھایا جاتا تھا۔ ان مدرسوں سے جو لوگ پڑھ کر نکلتے، وہ اپنی اپنی بستیوں میں جاکر دوبارہ اسی قسم کے ادارے قائم کرتے۔ مدرسوں کو بنیاد بنا کر کام کرنے کا یہی طریقہ تھا جس نے ایک سو برس کے اندر اندر اس وقت کی آباد دنیا کے بڑے حصے کے مذہب، تہذیب اور زبان کو بدل ڈالا۔

قرآن ایک دائمی معجزہ ہے۔ خالق کائنات نے اس کے ذریعے اپنے بندوں سے کلام کیا ہے وہ اس دنیا میں خدا اور بندہ کا مقام اتصال ہے، وہ دلوں کو گرماتا ہے اور شعور کو بیدار کرتا ہے۔ اس کے اعلیٰ مضامین اور اس کا آسمانی ادب اتنا اثر انگیز ہے کہ جو شخص بھی قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے، اس کی صداقت کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رسول کی زندگی اور آپ کے اصحاب کے حالات انسانی تاریخ کا انتہائی حیرت ناک انقلابی واقعہ ہیں جو زندگیوں کو گرمانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ دور اول کے مدرسے بس انہی چیزوں کو زندہ کرنے کے ادارے تھے۔ وہ سادہ طور پر عربی زبان سکھا کر آدمی کو قرآن و حدیث سے وابستہ کر دیتے تھے۔ اس کے بعد آدمی ایمان اور حرارت کے ان خزانوں سے براہ راست اپنا دین اخذ کرنے لگتا تھا۔ علم دین اس کے لئے صحبت رسول اور صحبت صحابہ کے ہم معنی بن جاتا تھا۔ خدا کی کتاب اس کی فطرت کو جگاتی تھی۔ رسول اور آپ کے اصحاب کی انقلابی زندگیاں اس کے سینہ میں عمل کی آگ بھر دیتی تھیں۔ اس طرح زندہ انسانوں کی وہ فوج تیار ہوتی تھی جو خدا کے لئے جینے اور خدا کے لئے مرنے کے سوا کوئی اور بات اس دنیا میں نہ جانتی تھی۔

آج ہمارے یہاں پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مدرسے قائم ہیں مگر آج ان مدرسوں کا وہ فائدہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے جو دور اول میں ظاہر ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مدرسے اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے اس سے بالکل مختلف ہیں جو صحابہ و تابعین نے قائم کئے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مدرسوں میں تعلیم دین کو ایک فن بنا دیا گیا ہے۔ قرآن اس لئے اترا کہ اس کو پڑھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوں اور ان کے دل خدا کی یاد سے دہل اٹھیں۔ مگر ان مدرسوں کے نصاب میں قرآن کو صرف ضمنی مقام حاصل ہے۔ رسول کی زندگی اور صحابہ کے حالات جو تاریخ انسانی میں آتش فشاں کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو سرے سے پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ احادیث و آثار کا مقام ہمارے مدارس میں صرف یہ ہے کہ ان کو عنوان بنا کر جزئیات فقہ کے کچھ خود ساختہ مسائل پر لامتناہی بحثیں جاری رکھی جا سکیں (اسی کے ساتھ "علوم آلیہ" کے نام پر جو فنون پڑھائے جاتے ہیں وہ اتنے فرسودہ

ہیں کہ ذہن کو جمود اور لایعنی موشگافیوں کا عادی بنانے کے سوا کوئی دوسری خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ اسلامی مدرسہ کی فضا کو اللہ کی بڑائی کے چرچے سے معمور رہنا چاہئے۔ مگر ہمارے موجودہ تعلیمی ادارے زوال کی جس سطح پر ہیں وہ یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنے کچھ بزرگ اور اکابر بنا رکھے ہیں اور مدرسہ کی تمام سرگرمیاں بس انھیں بزرگوں کی کبریائی کا سبق دینے کے لئے وقف رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ یہاں لوگوں کو ایمانی حرارت کا سبق ملے، یہاں اعلیٰ انسانی کردار ڈھلیں۔ یہاں خدا و آخرت کی تڑپ رکھنے والے لوگ پیدا ہوں، یہاں سے اسلام کا وہ سیلاب اٹھے جو دور اول کے مدرسوں سے اٹھا تھا اور ایک عالم پر چھا گیا تھا۔

ضرورت ہے کہ دوبارہ دور اول کے طرز کے مدرسے قائم ہوں اور ان کو بنیاد بنا کر اصلاح امت کا کام کیا جائے۔ ان مدارس کا نصاب بالکل سادہ اور غیر فنی ہونا چاہئے۔ موجودہ حالات کے لحاظ سے ہم اس کو چار مرحلوں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا مرحلہ: عربی زبان اور قرآن

دوسرا مرحلہ: حدیث، سیرت رسول، حالات صحابہ، اسلامی تاریخ وغیرہ (عربی زبان میں)

تیسرا مرحلہ: عالمی زبانیں، دیگر مذاہب اور ان کی تاریخ۔ فلسفہ جدید، ضروری سائنسی معلومات

چوتھا مرحلہ: اختصاصی مطالعہ کسی ایک اسلامی موضوع پر (عربی میں ایک مقالہ تیار کرنا)

اس قسم کا ایک مدرسہ اعلیٰ معیار پر قائم ہو جائے تو بلاشبہ وہ دور جدید کا سب سے بڑا کام ہوگا۔

اصل کام علوم قرآنی کو زندہ کرنا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد

اس بوالعجبی پر ہمیشہ ماتم کیا جائے گا کہ تمام علوم اسلامیہ کے درس و تدریس کا اصل مقصود قرآن تھا اور سب کے سب اس کے لئے بمنزلہ آلات و وسائل تھے۔ مگر اجرام سماویؔ کا مطالعہ کرنے والا دوربین کے بنانے میں ایسا غرق ہوا کہ اسے آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی یعنی معقولات اور فلسفہ و کلام اصل مقصود بن گئے اور قرآن اور علوم قرآن بالکل نظر انداز کر دیئے گئے پھر یہ حالت یہاں تک بڑھی کہ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ہمارے مدارس کا اصل مقصود کیا ہے۔ ارسطو اور اس کے بہت بعد کے کج فہم ترجمانوں کی پرستش یا قرآن حکیم و حدیث نبوی کا فہم و درس (ہمارے مدارس میں) معقولات قدیم کے لئے تو متون و شروح کے بوجھ سے دماغوں کو کچلا جاتا ہے۔ مگر قرآن اور علوم قرآن کے لئے صرف جلالین و بیضاوی کے چند اجزا ہی کافی سمجھ لئے گئے ہیں۔ اور پھر کیا ان کتابوں کے ذریعے قرآن اور علوم و معارف قرآن سے کوئی حقیقی مناسبت پیدا ہو سکتی ہے

چند معاصرین

فیروز شاہ تغلق	شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی
سلطان محمد شاہ بہمنی	شیخ زین الدین
شہنشاہ بابر	شیخ عبدالقدوس گنگوہی
شہنشاہ اکبر	ملا عبدالنبی
شہنشاہ جہانگیر	شیخ احمد سرہندی
احمد شاہ ابدالی	شاہ ولی اللہ دہلوی
نظام حیدر آباد	شیخ حسین احمد مدنی

پچاس برس پہلے کی بات ہے جب کہ ساری دنیا میں یورپ کی مسیحی قوموں کا غلبہ تھا۔ قاہرہ کے ایک عیسائی مشنری مسٹر واٹسن سے ایک شخص نے پوچھا: کتنے دنوں سے آپ مسیحی تبلیغ کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ "پچاس سال سے" پادری نے جواب دیا۔ "اتنے دنوں میں کتنے مسلمانوں نے عیسائیت کو اختیار کیا" اس کا اگلا سوال تھا۔ "تقریباً ڈیڑھ سو" پادری نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی بولا: "مگر پھر بھی آپ کو خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔"

سوال کرنے والے کے لئے پادری کا یہ جملہ غیر متوقع تھا۔

"اس سے آپ کی کیا مراد ہے" اس نے دوبارہ پوچھا۔ اس کے بعد پادری نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

They are apt to become Christian for material motives. Then at their death they recant.

وہ مادی محرک کے تحت عیسائی ہو جاتے ہیں اور پھر موت کے وقت توبہ کر لیتے ہیں

Stanwood Cobb,
Security For A Failing World,
Baha'i Publishing Trust
P.O. Box 19, New Delhi 1
1971, P. 91

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

افریقی ریاست گابون کے صدر البرٹ برنارڈ بانگو (پیدائش ۱۹۳۵) نے ستمبر ۱۹۷۳ء میں اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح کی خبریں مسلسل آتی رہتی ہیں جب کہ نہ صرف عوام بلکہ ممتاز افراد اسلام کی صداقت کا اعتراف کرتے رہتے ہیں مسٹر ایشی تنا کا جاپان کے محکمہ پولیس کے ڈائرکٹر تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ سیاست میں داخل ہوئے اور جاپانی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں وہ ٹوکیو کے اسلامی مرکز میں آئے اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ مسٹر ٹامسن امریکہ کے ۳۱ سالہ صحافی ہیں، انھوں نے فارسی زبان سیکھی ہے۔ فل برائٹ اسکالرشپ کے تحت وہ ایک سال سے افغانستان میں ہیں اور مولانا روم کی مثنوی کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ترجمہ پڑھا اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ وہ اسلام سے متاثر ہو گئے۔ ۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء کو وہ اجمیر میں مسلمان ہو گئے۔ ان کا اسلامی نام معین الدین ٹامس رکھا گیا۔ شاہجہانی مسجد درگاہ خواجہ صاحب میں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے ان کو کلمۂ شہادت پڑھایا۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ حتیٰ کہ ان کی تحریکوں کے غلغلہ سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ مگر وہی ایک کام انھوں نے نہ کیا جو ان کے خدا نے سب سے زیادہ ان پر فرض کیا تھا یعنی اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچانا۔ تاہم مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر دین فطرت لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا ہو کہ اللہ کے بندے اللہ کے دین کو قبول کر کے اس میں داخل نہ ہو رہے ہوں۔ مسلمانوں کو تو یہ توفیق بھی نہ ہو سکی کہ وہ کوئی ایسی ایجنسی

قائم کرتے جو ان نومسلموں کے اعداد و شمار جمع کر کے شائع کرتی ۔ البتہ عالمی ادارہ مذہب (World Religions Institute) نے حال میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے ہیں ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۵ء تک کے پانچ سالوں میں تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا ۔ یہ اعداد و شمار صرف یورپ اور امریکہ سے متعلق ہیں ۔ افریقہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی اور عیسائی مشنریوں کی غیر معمولی جدو جہد کے باوجود عیسائی بننے والوں کے مقابلہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے ۔ السٹریٹڈ ویکلی کے ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ نے اپنے افریقی دورہ کے تاثرات کے ذیل میں لکھا تھا :

"کینیا اور یوگنڈا کے اپنے آخری سفر میں میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی ان تبلیغی کوششوں کا جائزہ لیا جو نیگرو قبائل کے درمیان جاری ہیں ۔ عیسائیوں نے تسلیم کیا کہ مسلم عرب بردہ فروشوں کی ناخوش گوار یادوں کے باوجود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد عیسائی بننے والوں سے زیادہ ہے ۔"

(السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا ۔ ۷ / جولائی ۱۹۷۴ء ، صفحہ ۲۷)

اگرچہ ہمارے پاس قطعی اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم یہ اندازہ مبالغہ آمیز نہیں کہ آج بھی کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر دنیا بھر میں جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کی تعداد سالانہ دو لاکھ سے زیادہ ہے ۔ اگر ان نومسلموں سے روابط قائم کئے جائیں اور ان سے معلوم کیا جائے کہ اسلام کی کون سی خصوصیت نے انھیں متاثر کیا اور پھر ان معلومات کی روشنی میں عالمی سطح پر اسلام کی اشاعت کی منصوبہ بندی کی جائے تو صرف دس برس میں اسلام کی سربلندی کا وہ خواب پورا ہو سکتا ہے جس کو دوسری راہوں سے دو سو برس سے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر وہ حاصل نہیں ہوتا ۔

لطیفہ

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۱۹۳) کی عمر کا بیش تر حصہ بے سروسامان درویشوں کی طرح سفر میں گزرا ۔ ایک مرتبہ دمشق میں تھے ، وہاں کے لوگوں سے کسی بات پر ناراضگی ہوئی تو فلسطین کے بیابان میں چلے گئے ۔ یہ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا ۔ وہاں عیسائیوں نے ان کو پکڑ لیا اور طرابلس الشرق (لبنان) کے علاقہ میں خندق کھودنے کے کام پر دوسرے قیدیوں کے ساتھ لگا دیا ۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس مشقت کو برداشت کرتے رہے ۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی اس طرف سے گزرا ۔ وہ شیخ سعدی کو جانتا تھا ، انھیں اس حال میں دیکھ کر اس کو بہت افسوس ہوا ۔ دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑایا اور اپنے ساتھ حلب لے گیا ۔ وہاں عزت کے ساتھ اپنے گھر رکھا اور مزید عنایت یہ کی کہ اپنی ناکتخدا بیٹی سے ان کا نکاح ایک سو دینار مہر موجل پر کر دیا ۔ مگر بیوی سخت بدمزاج اور تیز زبان نکلی ۔ اس نے شیخ کو بے حد پریشان کر دیا ۔ ایک روز طعنہ دیتے ہوئے کہا : "تم وہی ہو جس کو میرے باپ نے دس دینار میں خریدا تھا" شیخ سعدی نے فوراً جواب دیا :

" ہاں میں وہی ہوں جس کو آپ کے باپ نے دس دینار میں خریدا اور سو دینار میں آپ کے ہاتھ بیچ ڈالا "

بدلتی ہوئی دنیا

موجودہ صدی کی آٹھویں دہائی نے حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھی ہیں۔ پٹرول کی طاقت، جس کا تین چوتھائی حصہ اسلامی دنیا کی زمین کے نیچے ہے۔ اس نے ظاہر ہو کر دنیا کا اقتصادی اور سیاسی نقشہ بالکل بدل دیا ہے۔ امریکہ اپنی خارجہ سیاست بدلنے پر مجبور ہو گیا، جاپان کی معجزانہ صنعتی ترقی ٹھپ ہو گئی۔ برطانیہ جو کبھی شرق اوسط کا حکمراں تھا۔ آج شرق اوسط کے ملکوں سے قرض لے رہا ہے، وغیرہ۔ "ساتویں صدی عیسوی میں جبکہ اسلامی فوجیں عرب جزیرہ نما پر چھا گئیں تاکہ وہ محمد کے پیغام کو پھیلائیں۔" نیوز ویک (نیویارک) نے ۱۸ فروری ۱۹۷۴ء کے ایک خصوصی مضمون میں لکھا "اس کے بعد عربوں نے اپنی تاریخ میں پہلی بار اس قسم کی کامیابی حاصل کی ہے۔ کسی زمانے میں اگر تمام سڑکیں روم کو جاتی تھیں تو آج تمام سڑکیں ریاض کو جا رہی ہیں جہاں ہر روز مغربی قوموں کے نمائندے اتر رہے ہیں تاکہ وہ جدید دنیا کے قارون (شاہ فیصل) سے ملاقات کر سکیں" اس قسم کی باتیں لکھتے ہوئے امریکی میگزین نے اعتراف کیا تھا:

The mountain, at last, is coming to Mohammad

اس جملہ کا پس منظر یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ کی مسیحی قوموں نے پیغمبر اسلام کو "جھوٹا پیغمبر" ثابت کرنے کے لئے فرضی قصے گھڑنے شروع کئے تو انھیں میں سے ایک بناوٹی کہانی وہ تھی جو اتنی پھیلی کہ مغربی لٹریچر میں بطور ضرب المثل مشہور ہو گئی۔ فرانسس بیکن (۱۶۲۶ ــ ۱۵۶۱) نے اپنے مضمون جرأت (Boldness) میں لکھا ہے "ایک جری آدمی محمد جیسے معجزے بار بار دکھا سکتا ہے۔ محمد نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑ کو اپنے پاس بلائیں گے اور وہ ان کے پاس آجائے گا۔ لوگ اس معجزے کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ محمد نے پہاڑ کو اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ وہ بار بار پکارتے رہے۔ جب پہاڑ بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا تو وہ ذرا بھی نہ شرمائے۔ اب انھوں نے کہا: اگر پہاڑ محمد کے پاس نہیں آیا تو محمد تو پہاڑ کے پاس جا سکتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں تیزی سے ایک تبدیلی آرہی ہے۔ اور اگر ہم گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اس تبدیلی کا رخ کھلے طور پر اسی منزل کی طرف ہے جس کو امریکی میگزین نے لطیفہ کے طور پر ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔ "پہاڑ بالآخر محمد کی طرف آرہا ہے۔"

پہلی انجمن اقوام ۱۹۲۰ میں جنیوا میں قائم ہوئی تو روس اور امریکہ ابتداءً اس کے ممبر نہ ہو سکے تھے۔ دوسری بار ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو اس کا چارٹر ماسکو میں تیار کیا گیا اور امریکہ اس کا مستقل صدر مقام بنا۔ اب اگرچہ کسی نئی عالمی تنظیم کے وجود میں آنے کا بظاہر امکان نہیں، تاہم اقوام متحدہ کا ادارہ تیزی سے تیسرے انقلاب کی طرف جا رہا ہے

اقوام متحدہ کے ابتدائی قیام کے وقت یہ صورت حال تھی کہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصہ پر مغربی طاقتیں قابض تھیں اور وہی ان کی سیاسی نمائندہ بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح عالمی برادری کی تنظیم میں مغربی طاقتوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ افریشیائی قوموں کو آزادی ملی تو ایک تیسری دنیا وجود میں آئی اور عالمی تنظیم میں اس کی بڑھتی ہوئی نمائندگی نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ان قوموں کو اکثریت دے دی جو اقوام متحدہ کے قیام کے وقت براہ راست نمائندگی سے محروم تھیں۔ ۱۹۴۵ء میں

اقوام متحدہ کے اکیاون ممبر تھے۔ ۱۹۷۵ء میں ان کی تعداد ۱۴۰ ہو چکی ہے۔

اس طرح قدیم توازن ٹوٹنے لگا۔ ۱۹۷۱ء میں جب امریکہ کی مرضی کے خلاف فارموسا کے بجائے کمیونسٹ چین کو چین کا نمائندہ تسلیم کیا گیا تو ظاہر ہو گیا کہ اب عالمی سیاست میں مغربی طاقتوں کا کلی غلبہ ختم ہو رہا ہے۔ پھر اکتوبر ۱۹۷۳ء کی عرب۔اسرائیل جنگ کے بعد عربوں کی طرف سے تیل کے جزوی بائیکاٹ اور تیل کی قیمت میں اضافہ نے اس عمل کو آخری مقام پر پہنچا دیا اور یہ نوبت آگئی کہ سلامتی کونسل کے علاوہ اقوام متحدہ کے تمام دوسرے اجلاسوں میں مغربی طاقتوں کے علی الرغم عربوں کے حق میں فیصلے ہونے لگے۔ امریکہ نے دھمکی دی کہ "بلاک ووٹنگ" کا سلسلہ جاری رہا تو وہ سخت کارروائی کرے گا۔ جب یہ دھمکی کارگر نہ ہوئی تو ستمبر ۱۹۷۵ء میں امریکہ نے یونیسکو کو دی جانے والی ۲۲ ملین ڈالر سالانہ کی امداد روک دی۔ کیونکہ اس ادارہ سے اسرائیل کو نکال دیا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد جو ہوا وہ صرف یہ کہ عربوں نے اس کے فوراً بعد یونیسکو کو ۲۵ ملین ڈالر دینے کا اعلان کر دیا۔

عالمی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ عربی کا اقوام متحدہ کی چھٹی سرکاری زبان قرار دیا جانا اور عربوں کے مقابلے میں اسرائیل اور اس کے حلیف امریکہ کا احتجاجی پوزیشن میں پہنچ جانا بتاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ اقوام متحدہ کا رخ "مغرب" کے بجائے "مشرق" کی طرف ہو جائے۔

عربی زبان نئی اہمیت اختیار کر رہی ہے

بیروت عربوں کے لئے چھٹیاں گزارنے کا مقام تھا۔ بیروت کی غیر یقینی صورت حال کے بعد بمبئی نے، کم از کم عارضی طور پر، یہ حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جنوری۔ اگست ۱۹۷۶ کے درمیان بمبئی میں آنے والے مغربی ایشیا کے سیاحوں کی تعداد ۲۱ ہزار تھی۔ یہ سیاح زیادہ تر سعودی عرب، ایران، مصر اور دبئی کے رہنے والے ہیں۔ ان میں سے کچھ صرف اس لئے آئے کہ "اپنے ملک میں تیل کی بارش دیکھنے کے بعد ہندوستان میں پانی کی بارش بھی دیکھیں"، کچھ تجارت کے لئے اور کچھ علاج کے لئے یہاں آئے۔

عرب سیاحوں کی یہ کثرت دیکھ کر ہندوستان کے محکمہ سیاحی نے اپنا ایک آفس کویت میں کھول دیا ہے۔ دوسرا ایران میں کھولا جانے والا ہے۔

عرب سیاح عام طور پر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ آتے ہیں اور زیادہ تر اپنے ہوٹل میں مقیم ہوتے ہیں۔ روزانہ جو رقم خرچ کرتے ہیں اس کی تعداد ہوٹل کے ذمہ داروں کے بیان کے مطابق فی کس تین ہزار سے پانچ ہزار روپے تک ہے۔ ایک عرب "سوداگر" نے اپنے بمبئی کے زمانہ قیام میں ۱۷ ہزار روپے خرچ کئے اور تین ہزار ٹپ کے طور پر دیئے

ان عربوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ زبان کا ہے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد صرف عربی جانتی ہے۔ جو لوگ انگریزی جانتے ہیں، ان کی انگریزی بھی بہت معمولی ہوتی ہے۔ ان کی اس کمی نے ترجمانوں کی بہت بڑی مانگ پیدا کر دی ہے

ہمارے عربی مدارس کے نوجوان اگر عربی بول چال کی مشق کر لیں اور اس کے ساتھ انگریزی زبان بھی سیکھ لیں تو ہندستان اور ہندوستان کے باہر بہت معقول کام اپنے لئے پا سکتے ہیں۔

جب کوئی قوم سیاسی یا اقتصادی اعتبار سے اٹھتی ہے تو اس کے ساتھ اس کی زبان بھی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی اس وقت عربی زبان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ عرب پٹرول نے عربی زبان کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ بے شمار نئے نئے لسانی کام وجود میں آگئے ہیں۔ مگر ان نئے مواقع سے وہی لوگ پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عربی کے ساتھ کم از کم ایک اور بین اقوامی زبان جانتے ہوں۔ اور جو شخص عربی جیسی زبان جان لے، اس کے لئے دوسری زبان سیکھنا کچھ مشکل نہیں۔

غلط اقدام کبھی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا

خواہ اس کو کرنے والے کتنے ہی مخلص اور مقدس ہوں

مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰ - ۱۸۶۳)

ایک بلند پایہ محقق اور مفسر تھے۔ اردو کے علاوہ عربی، فارسی انگریزی اور عبرانی زبانیں بخوبی جانتے تھے۔ تقدس اور اخلاص اور اتباع سنت میں ان کو کاملیت کا مقام حاصل تھا۔ اردو یونیورسٹی کا تخیل جس نے بالآخر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی صورت اختیار کی انھیں کے ذہن کی تخلیق تھی۔ اگرچہ جغرافی اور زمانی حقائق نے ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد اس کا خاتمہ کر دیا۔ عالم اسلام میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی عربی تفسیر نظام القرآن لکھنا شروع کی، مگر اس کی تکمیل سے پہلے اس دنیا سے چلے گئے۔ وہ شریعت کی بنیاد پر سیاسی نظام قائم کرنے کو مسلمانوں کی اصل اجتماعی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ "ملکوت اللہ" کے نام سے انھوں نے اس موضوع پر ایک عربی رسالہ بھی لکھا ہے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جماعت اسلامی کی حکومتِ الٰہیہ کسی حد تک انھیں کے افکار کی عملی صورت تھی۔ مگر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں یہ جماعت حالات کی چٹان سے ٹکرا کر اسی طرح ختم ہو رہی ہے جس طرح اس دور کی بہت سی دوسری سیاسی تحریکیں طوفان کی طرح اٹھیں اور بلبلوں کی طرح ختم ہو گئیں۔

مولانا فراہی کے شاگرد خاص مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے:

"علی گڑھ میں مولانا نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ خاص توجہ کے ساتھ فلسفہ جدید کی تحصیل کی۔ اس زمانہ میں علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر مشہور انگریزی مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ تھے۔ مولانا نے فلسفہ کے درس تو ان سے ضرور لئے لیکن ان سے خوش نہیں تھے۔ وہ آرنلڈ صاحب کو بھی اسی بساط سیاست کا ایک مہرہ سمجھتے تھے جو انگریزوں نے علی گڑھ میں بچھا رکھی تھی۔ علی گڑھ کا حلقہ ڈاکٹر آرنلڈ صاحب کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کا بڑا مداح تھا۔ لیکن مولانا اس کتاب کے سخت مخالف تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے اندر سے روح جہاد ختم کرنے کے لئے لکھی گئی ہے"۔ ترجمہ قرآن مجید، صفحہ ۱۶

انیسویں صدی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جو مفکرین اٹھے، وہ تقریباً سب کے سب اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جو بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں، انھوں نے سیاسی انقلاب کو اسلام کے احیاء کا واحد راستہ سمجھا۔ دنیوی نتائج کی حد تک یہ تمام تحریکیں ناکام رہیں تاہم اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد اس قسم کے لوگوں کو اب کرنے کا کوئی کام ہی نظر نہیں آتا۔ وہ تحریکیں جو آسمانی عزائم کے ساتھ اٹھی تھیں، اب بے یقینی اور پست حوصلگی کی سطح پر آکر ٹھہر گئی ہیں۔ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان تحریکوں نے اپنے سیاسی جہاد میں جو دولت و طاقت خرچ کی ہے، اگر ان کو وہ دعوت و اشاعت کے ان غیر سیاسی طریقوں میں خرچ کرتیں جن کا تاریخی ریکارڈ "پریچنگ آف اسلام" میں جمع کیا گیا ہے، تو اسلام کا احیاء شاید آج ایک واقعہ بن چکا ہوتا۔ اس دور کے مفکرین کی بہت بڑی غلطی تھی کہ انھوں نے

قتال اور سیاسی معرکہ آرائی کو وہ چیز سمجھ لیا جس کو شریعت میں جہاد کہا گیا ہے۔ امت مسلمہ کا جہاد، دعوت ہے نہ کہ قتال اور سیاسی معرکہ آرائی۔ یہ بات قرآن میں انتہائی طور پر واضح ہے۔ مگر اس دور کے مجاہدین سے اس بارے میں سخت ذہول ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوری ایک صدی تک یہ لوگ سیاست کے میدان میں قربانیاں دیتے رہے۔ اور کسی نے بھی اس اصل ضرورت کا احساس نہ کیا کہ دین حق کی پیغام رسانی کے لئے دعوتی مہم کا آغاز کیا جائے۔ اگر یہ فکر ہوتا تو دعوتی انداز کا لٹریچر تیار کیا جاتا۔ دعوتی انداز کی تنظیم قائم ہوتی۔ دعوتی انداز کی سرگرمیوں کے لئے منصوبہ بندی کی جاتی۔

اس دور میں دعوت الی اللہ کے زبردست نئے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ مگر وہ سب غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہے اور تمام لوگ سیاسی قربانیوں کا ٹائٹل لے لے کر اس دنیا سے چلے گئے۔

اس اندوہناک غلطی کی تلافی یہ ہے کہ دعوتی بنیاد پر از سر نو کام کا آغاز کیا جائے۔ صرف دعوتی کام ہی ہم کو دنیا و آخرت میں سرخرو کر سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے کام ہیں خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہیں۔

غلط اقدام کبھی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ خواہ اس کی پشت پر ہم نے اخلاص اور تقدس کی کتنی ہی مقدار جمع کر دی ہو۔

ایک تقابل

صوفی نذیر احمد کاشمیری

اگر مہاتما بدھ کے انتقال کے دو سو برس بعد مہاراجہ اشوک بدھ ازم میں داخل نہ ہوتے اور حضرت مسیح کے دنیا سے چلے جانے کے ساڑھے تین سو برس بعد شہنشاہ قسطنطین عیسائیت کو قبول نہ کرتے تو یہ مذاہب شاید ہی عالمی مذاہب بن کر کوئی تاریخی حیثیت اختیار کر سکتے۔ شاید یہ دونوں اپنے اپنے وقت کے مذاہب (برہمن ازم اور یہودیت) کی بے اعتدالیوں کے خلاف محض احتجاجی قسم کے فرقوں کی حیثیت سے آگے نہ بڑھتے۔ اس کے برعکس اگر اسلام کو اپنی اسی ابتدائی صورت میں سو برس تک کام کرنے کا موقع میسر رہتا جس صورت پر اس کو حضرت خاتم الانبیاء نے قائم کیا تھا اور جو صرف حضرت ابوبکر و عمر کے دور کے خاتمے تک جوں کی توں قائم رہی، تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شاید دنیا کا اکثر حصہ مسلمان ہو جاتا، اور کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً کی عملی تعبیر چودہ سو برس پہلے ہو چلی تھی۔ لیکن دور ملوکیت کے بھرپور قیام نے ملت اسلامیہ کو کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور لِتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ کے مقام سے گرا کر اور اسے ایک دنیادار ملت بنا کر بالکل بنی اسرائیل اور برہمنوں کی طرح کنبہ داری، تحاسد و تباغض و تنافر کا شکار کر دیا۔ اس کا ابتدائی سہرا تو بنو امیہ کے سر ہے۔ بعد میں بنو ہاشم نے اسے آج تک جاری رکھا ہے۔ گویا جس ملوکیت نے بدھ ازم اور عیسائیت کو عالمی مذاہب بنا کر ان میں چار چاند لگا دیئے، وہی ملوکیت اسلام کی عالم گیری کے مقابل سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ (۷۴)

اسی طرح یہ بھی ایک افسوسناک تقابل ہے کہ جہاں راہبان مسیح نے مختلف کشف و رؤیا و الہام کا سہارا لیتے ہوئے اپنی دعوت کا رُخ بنی اسرائیل سے ہٹا کر سارے عالم کی طرف کر دیا، وہاں ملت اسلامیہ کے ارباب کشف و رؤیا نے انھیں کشفیات و رؤیا کے سہارے امت اسلامیہ کو اپنے عالمی مشن سے ہٹا کر اس کا رُخ ایسی باطنیت کی طرف کر دیا جو امت میں عالمگیر تفرقے کو جنم دے کر ایک خواب و خیال کی دنیا بنا چکا ہے۔ (۸۰)

کبھی پیچھے ہٹنا سب سے بڑا اقدام ہوتا ہے مگر اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو بڑے دل والے ہوں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ ھ) کے بعد ۲۰ سال تک فتوحات اسلام کا زبردست سلسلہ جاری رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے علاقہ کے فتح کی خبر آتی تھی۔ مگر تیسرے خلیفہ کی شہادت (۳۵ ھ) کے ساتھ جو باہمی لڑائیاں شروع ہوئیں، انھوں نے تقریباً ۱۰ سال تک فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ وہ شخص جس نے اس بند دروازہ کو دوبارہ کھولا، وہ حضرت امام حسنؓ تھے ۴۱ھ میں آپ کی خلافت سے دست برداری بظاہر میدان عمل سے واپسی کا ایک فیصلہ تھا۔ مگر اس واپسی نے اسلامی تاریخ میں اقدام و عمل کے نئے امکانات کھول دیئے۔

حسن بن علی بن ابی طالب شعبان ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاول ۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے والد حضرت علیؓ کی شہادت ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو کوفہ میں ہوئی تو آپ کی عمر ۳۷ سال تھی۔ اس وقت صرف عراق اور ایران حضرت علیؓ کے زیر خلافت رہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر وغیرہ میں امیر معاویہ کی حکومت قائم تھی۔ حضرت علیؓ کے زیر خلافت علاقہ میں بھی بہت سے لوگ درپردہ آپ کے مخالف تھے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد لوگوں نے امام حسن کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی جو آپ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔

حضرت حسن نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خلافت کی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ مگر ان کے اندر چونکہ اقتدار کی ہوس نہ تھی، انھوں نے بہت جلد اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ موجودہ حالات میں ان کا خلافت پر اصرار کرنا صرف ملت کے انتشار میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا۔ انھوں نے ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ایک بار اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسین سے کہا تھا:

"میں جانتا ہوں کہ نبوت و خلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہ سکتیں"

اسی نزاکت کی وجہ سے آپ نے بیعت کے وقت لوگوں سے یہ اقرار لے لیا تھا کہ "میں جس سے جنگ کروں تم اس سے جنگ کروگے، میں جس سے صلح کروں تم اس سے صلح کروگے"

حضرت علیؓ کے بعد کوفہ کے لوگوں نے حضرت حسن کو خلیفہ بنایا۔ دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے لئے حضرت علی کا اس دنیا سے جانا گویا راستہ صاف ہونے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے حضرت علی کی شہادت کی خبر ملتے ہی اپنے لئے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کر لیا اور یہ منصوبہ بنایا کہ بقیہ اسلامی علاقوں (عراق و ایران) کو بھی اپنے ماتحت کر کے اپنی حکومت کو مکمل کر لیں۔ امیر معاویہ تجدید بیعت سے فارغ ہونے کے بعد ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر دمشق سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوفہ میں داخلہ سے پہلے انھوں نے امام حسن کو پیغام بھیجا کہ جنگ سے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے صلح کر لیں اور مجھ کو خلیفہ وقت تسلیم کر لیں۔ امام حسن کے پاس بھی اس وقت ساٹھ ہزار کا لشکر تھا جو لڑنے مرنے پر تیار تھا۔ مگر امام حسن نے مسلمانوں کو باہمی خوں ریزی سے بچانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ اپنے حق خلافت سے از خود دست بردار ہو گئے اور صرف چھ ماہ خلیفہ رہ کر امیر معاویہ کے ہاتھ کوفہ کی مسجد میں بیعت کر لی۔

امام حسن کے پرجوش حامیوں کے لئے یہ "ذلت" ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف بہت شور وغل کیا۔ آپ کو عار المسلمین (مسلمانوں کے لئے ننگ) کا خطاب دیا، کہا کہ آپ کافر ہو گئے ہیں۔ آپ کے کپڑے نوچے، حتیٰ کہ آپ پر تلوار سے حملہ کیا۔ مگر آپ کسی بھی حال میں مقابلہ آرائی کی سیاست اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بلکہ فرمایا:

"خلافت اگر معاویہ بن ابوسفیان کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا۔ اور اگر یہ میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا۔"

ایک شخص کے پیچھے ہٹ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اجتماعیت میں تبدیل ہو گیا اور سلسلہ جو اسلامی تاریخ میں صفین و جمل کے بعد تیسری سب سے بڑی باہمی خوں ریزی کا عنوان بنتا، عام الجماعت کے نام سے پکارا گیا۔ وہ اختلاف کے بجائے اتحاد کا سال بن گیا۔ مسلمانوں کی قوت جو آپس کی لڑائیوں میں برباد ہوتی، اسلام کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی پیچھے ہٹنے ہی کا نام آگے بڑھنا ہوتا ہے اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

رعایت نہیں صلاحیت

ہمارے ملک کی مسلم قیادت نے مسلمانوں کے مسئلہ کے حل کا جو آخری راز دریافت کیا ہے، وہ یہ کہ "مسلمانوں کو وہ رعایتیں دی جائیں جو شیڈیولڈ کاسٹ کے لئے مخصوص کی گئی ہیں" اولاً تو یہ ممکن نہیں۔ اور بالفرض یہ ناممکن اگر ممکن بھی ہو جائے تو یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی کوئی رعایت زندگی کے وسیع تر حقائق کا بدل نہیں بن سکتی۔ یہ دنیا استعداد کی بنیاد پر جگہ حاصل کرنے کی دنیا ہے۔ یہاں محض رعایت سے کوئی شخص بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

ونے کرپال اور گووند کیلکر نے شیڈیولڈ کاسٹ اور قبائل کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان رعایتوں نے ان طبقات کی حالت میں کوئی حقیقی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ اب بھی اگر کوئی ہریجن کامیاب ہے تو وہ وہی ہے جس نے اپنے اندر کوئی خاص صلاحیت پیدا کی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر امبیدکر، شری جگ جیون رام۔ شری کے۔ آر نارائن وغیرہ۔

لکشمن ہلدر ایک مزدور تھے، پھر انھوں نے کچھ تعلیم حاصل کی اور ٹائپ کرنا سیکھا۔ اس کے بعد ان کو مرکزی حکومت میں زررو سیٹ کے تحت کلرکی کی ایک جگہ مل گئی۔ مگر ان کی انگریزی کمزور تھی۔ ان کے افسر نے ان کی کتاب میں لکھ دیا:

His English is weak

اس قسم کی رپورٹ تین سال تک درج ہوتی رہی۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر تین سال تک مسلسل کسی کے خلاف "بیڈ رپورٹ" ہوتی رہے تو اس کی ملازمت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لکشمن ہلدر کو ختم ملازمت کا نوٹس مل گیا۔ تاہم انھوں نے دوڑ دھوپ کی۔ ایک ڈائرکٹر کو ان پر رحم آگیا اور اس نے ان کی ملازمت میں چھ ماہ کی توسیع کر دی۔ اب لکشمن ہلدر نے محنت شروع کی اور مدت ختم ہونے تک انگریزی بولنے کی اچھی صلاحیت پیدا کر لی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ملازمت میں لے لئے گئے۔ (السٹریٹڈ ویکلی ۲۴ اپریل ۱۹۷۶)

لکشمن ہلدر کو بالآخر جس چیز نے جگہ دی وہ ان کی صلاحیت تھی نہ کہ رعایت۔ یہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے، چاہے وہ ہریجن ہو یا غیر ہریجن

مطالعہ کتب

دورِ جدید کے ہندو مفکرین میں سوامی ویویکانند (۱۸۶۳ - ۱۹۰۲) ایک نمایاں نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا انتقال صرف ۳۹ سال کی عمر میں ہوگیا۔ مگر وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریزی زبان میں ہندو فلسفہ کی تشریح کی اور مغربی دنیا میں اس ایشیائی مذہب کے پرچار کی ابتدائی بنیادیں رکھیں۔ اگرچہ اس سے پہلے خود مغرب میں کئی ایسے مفکرین پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے مغرب کو ہندو فلسفہ سے آشنا کیا۔ مثلاً شوپنہار (۱۷۸۸ - ۱۸۶۰) ایمرسن (۱۸۰۳ - ۱۸۸۲) اور میکس مولر (۱۸۲۳ - ۱۹۰۰) وغیرہ مگر خود بھارت کی طرف سے اس خدمت کو انجام دینے والوں میں پہلا قابل ذکر نام ویویکانند ہی کا ہے۔ ۱۸۹۴ میں جب شکاگو کی پارلیمنٹ آف ریلیجنز میں وہ اجنبی سنیاسی کے روپ میں کھڑے ہوئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

(امریکہ کے بہنو اور بھائیو)

SISTERS AND BROTHERS OF AMERICA

تو ان کے اس انداز خطاب پر کئی منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔ امریکہ کے لوگ جو لیڈیز اینڈ جنٹلمین (حاضرین اور حاضرات) جیسے خشک فقرے ہی سننے کے عادی تھے اس برادرانہ خطاب سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد عرصہ تک امریکہ میں ان کا لکچر ہوتا رہا اور وہاں انھوں نے پہلا ویدک سنٹر قائم کیا۔

حال ہی میں سوامی ویویکانند کے انگریزی خطوط کا مجموعہ ساڑھے چار سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں بہت سے دلچسپ خطوط ہیں جو سوامی جی کی زندگی اور خیالات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہاں ہم اس مجموعہ کے خط نمبر ۱۷۵ کا ترجمہ درج کر رہے ہیں۔ سوامی جی نے یہ خط الموڑہ سے ۱۰ جون ۱۸۹۸ کو لکھا تھا:

"ادویتا واد مذہب اور فکر کی دنیا میں آخری لفظ ہے اور واحد پوزیشن ہے جہاں سے ایک شخص تمام مذاہب اور فرقوں کو محبت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی روشن خیال انسانیت کا مذہب یہی ہوگا۔ ہندوؤں کو یہ کریڈٹ مل سکتا ہے کہ وہ اس نظریہ تک دوسری نسلوں سے قبل پہنچے۔ تاہم عملی ادویتا جو تمام انسانیت کو خود اپنی طرح دیکھتی ہے اور اپنوں کا سا سلوک کرتی ہے کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔

دوسری طرف میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب قابل لحاظ حد تک اس مساوات تک پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسی لئے میں قطعی طور پر یہ خیال رکھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانت کے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی عمدہ اور حیرت انگیز ہوں، وہ وسیع انسانیت کے لئے بالکل ہی بے قیمت ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

ہماری مادر وطن کے لئے، جو دو عظیم نظامات ہندو ازم اور اسلام کا مقام اتحاد ہے، ویدانت کا دماغ اور اسلام کا جسم ہی واحد امید ہے۔ میں اپنے تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندوستان موجودہ انتشار اور اختلاف سے نکل کر شاندار اور غیر مفتوح بن رہا ہے، اور یہ ویدانت کے دماغ اور اسلام کے جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے (صفحہ ۴۵۳)

I SEE IN MY MIND'S EYE THE FUTURE PERFECT INDIA RISING OUT OF THIS CHAOS AND STRIFE, GLORIOUS AND INVINCIBLE, WITH VEDANTA BRAIN AND ISLAM BODY. (P. 453)

ادویتا واد (یعنی خدا اور مخلوقات میں دوئی نہیں، سب ایک ہیں) میں بلاشبہ بظاہر ایک فلسفیانہ حسن ہے۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اخوت انسانی کے مسئلہ سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں جس کے لئے ایک نظریاتی بنیاد کے طور پر پچھلے

زمانہ کے فلسفیوں نے اس کو وضع کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے مقابلہ میں وحدت الٰہ اور وحدت بنی آدم کا عقیدہ انسانی اخوت ومساوات کی بالکل کافی بنیاد ہے اور اسلام کی تاریخ، کم از کم تجرباتی طور پر، اس کی حقانیت کا بھی ایک واضح ثبوت پیش کر رہی ہے۔

اخوت اور مساوات کی نظریاتی بنیاد ہمیں اس وقت مل جاتی ہے جب ہم دریافت کرتے ہیں کہ سارے انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ اس کے بعد یہ ضروری نہیں رہتا کہ اس سلسلۂ نسب کو خدا تک بھی پہنچایا جائے۔ اصل مسئلہ مخلوق اور مخلوق کے درمیان ٹکراؤ کو ختم کرنا ہے نہ کہ مخلوق اور خدا کے درمیان۔ اس لئے مخلوق کی نسلی یکسانیت مانتے ہی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس رشتہ کو خدا تک وسیع کرنے کی کوشش، مقصد کے اعتبار سے غیر ضروری ہے اور عملی اعتبار سے غیر ثابت شدہ اور نا قابل فہم۔

دوسری بات یہ کہ وحدت وجود کے نظریہ کو ماننے کے بعد صرف خدا اور انسان ہی ایک کل کا جزو نہیں بنتے بلکہ انسان اور بھیڑیا بھی ایک سطح پر آجاتے ہیں خواہ وہ انسانی بھیڑیا ہو یا حیوانی بھیڑیا۔ گویا ٹکراؤ کے جس مسئلہ کو ختم کرنا مقصود ہے وہ دوبارہ ایک نئی شکل میں لوٹ آتا ہے۔

Letters of Swami Vivikanand
Advaita Ashram
5, Dehi Entally Road
Calcutta 14 (197o, pp.463)

اسلام نے اس کے اندر نئی طاقت پیدا کر دی

خنسار (م ۲۴ھ) اسلامی دور کی شاعرہ ہے۔ اس خاتون کا اصل نام تماضر بنت عمرو بن الشرید سُلَمِیّہ ہے خنسار اس کا لقب تھا۔ بعد کو وہ اسی سے مشہور ہو گئی۔

وہ ایک بڑے خاندان میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ مضر کے قبیلہ بنو سلیم کا سردار تھا۔ اس کے دو بھائی جاہلی جنگ میں مارے گئے۔ اس کا اسے بہت صدمہ ہوا۔ اپنے بھائیوں کے قتل سے پہلے وہ دو یا تین اشعار سے زیادہ نہ کہتی تھی۔ مگر جب وہ مارے گئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو اور دل سے اشعار امڈنے لگے۔ اس نے دونوں بھائیوں خصوصاً صخر کے لئے انتہائی دردناک مرثیے لکھے۔ وہ برابر مرثیہ کہتی رہی اور روتی رہی، یہاں تک کہ اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔

فتح مکہ کے بعد اپنے قبیلہ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اسلام قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس نے اپنے کچھ اشعار سنائے تو آپ بہت متاثر ہوئے اور فرمایا "اور سناؤ خناس"۔ چنانچہ اس نے مزید اشعار آپ کو سنائے۔

مگر جوانی کی عمر میں جو عورت اپنے بھائی کی موت کو برداشت نہ کر سکی تھی، اسلام نے اس کے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ بڑھاپے کی عمر میں اس نے خود اپنے لڑکوں کو خدا کی راہ میں نثار کر دیا۔ اس کے چار جوان بیٹے تھے۔ چاروں کو اس نے جنگ قادسیہ میں جانے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ چاروں گئے اور چاروں لڑ کر شہید ہو گئے۔ جب اس کو خبر ملی کہ اس کے چاروں بیٹے ختم ہو گئے تو اس نے روتے یا مرثیہ کہنے کے بجائے نہایت صبر وسکون کے ساتھ اس خبر کو سنا اور پھر بولی:

"خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ان کی شہادت سے عزت بخشی۔ میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے ان سے ملا دے گا۔"

السيد جمال الدين وجه كل عنايته للسياسة

الأستاذ الامام محمد عبده

قال السيد جمال الدين الأفغانى

ان أهل أوروبا مستعدون لقبول الاسلام ، اذا أحسنت الدعوة اليه فقد قارنوا بين الدين الاسلامى وبين غيره فوجدوا البون شاسعا من حيث يسر العقائد وقرب تناولها ، وأقرب من أهل أوروبا الى قبول الاسلام أهل أمريكا لأنه لا يوجد بينهم وبين الأمم الاسلامية عداوات موروثة ولا أضغان مدفونة مثلما هو الحال بين المسلمين والاوربيين .

والقرآن من أكبر الوسائل فى لفت نظر الافرنج الى حسن الاسلام ، فهو يدعوهم بلسان حاله اليه ، لكنهم يرون حالة المسلمين السوآى من خلال القرآن فيقعدون عن اتباعه والايمان به ، فاذا أردنا اليوم أن نحمل غيرنا على الدخول فى ديننا ، وجب علينا قبل كل شىء أن نقيم لهم البرهان — على أننا متمسكون بخصال الاسلام .. والا لم نكن مسلمين كاملين .

وأفاض السيد فى (بيان) مزايا القرآن وتعاليمه السامية : من ذلك أنه (أى القرآن)أول من دلنا على الوصول الى الحقائق بالطريقة الفلسفية وهى (لمه) و (ولماذا) ، اذ أن معظم آيات القرآن واردة فى معرض : لم كان الأمر كذا ؟ ولماذا كان الأمر كذا ؟ وتكليف المخاطبين أن يعطوا الجواب المعقول على هذا السؤال ، وليست الفلسفة سوى ذلك .

قال : ومن مزايا القرآن « أن العرب قبل انزال القرآن عليهم كانوا فى حالة همجية لا توصف ، فلم يمض عليهم قرن ونصف من الزمان حتى ملكوا عالم زمانهم ، وفاقوا أمم الارض سياسة وعلما وفلسفة وصناعة وتجارة ، وكل هذا لعمرى لم ينتج الا عن هدى القرآن — فالقرآن وحده الذى كان كافيا فى اجتذاب الامم القوية وهدايتها جدير أن يكون كافيا اليوم أيضا فى اجتذاب الامم الحديثة وهدايتها .

السيد جمال الدين رجل عالم وأعرف الناس بالاسلام ، وحالة المسلمين ، وكان قادرا على النفع العظيم بالافادة والتعليم ، ولكنه وجه كل عنايته الى السياسة فضاع استعداده هذا وانى أعجب لجعل نبهاء المسلمين وجرائدهم — كل همهم فى السياسة ، واهمالهم أمر التربية الذى هو كل شىء ، وعليه يبنى كل شىء !

ان السيد جمال الدين كان صاحب اقتدار عجيب لو صرفه ووجهه للتعليم والتربية لأفاد الاسلام أكبر فائدة ، وقد عرضت عليه حين كنا فى باريس أن نترك السياسة ونذهب الى مكان بعيد عن مراقبة الحكومات ، ونعلم ونربى من نختار من التلاميذ على مشربنا ، فلا تمضى عشر سنين الا ويكون عندنا كذا وكذا من التلاميذ الذين يتبعوننا فى ترك أوطانهم والسير فى الأرض لنشر الاصلاح المطلوب فينتشر أحسن الانتشار ! فقال : انما أنت مثبط !

۱۸۸۴ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ پیرس میں تھے، انھوں نے جان لیا تھا کہ سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اہل مغرب کے درمیان اسلام کی اشاعت کی جائے اور اس کام کا سب سے مؤثر ذریعہ قرآن ہے۔ مگر انھوں نے اور ان کے بعد تقریباً تمام بہترین صلاحیت کے لوگوں نے اپنی عمریں اور اپنے ذرائع و وسائل لاحاصل قسم کی سیاسی مقابلہ آرائی میں کھو دئے

سید جمال الدین افغانی نے کہا: یورپ کے لوگوں کے سامنے اگر اسلام کی دعوت اچھی طرح پیش کی جائے تو وہ اسلام قبول کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اسلام اور دوسرے ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقیدہ و عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور مغربی اقوام میں قبول اسلام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب امریکہ کے لوگ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اور اسلامی قوموں کے درمیان اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں ہیں جو مسلمانوں اور یورپی قوموں کے درمیان ہیں۔

اہل مغرب کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے۔ قرآن کی دعوت اصل اسلام کی طرف ہے۔ مگر وہ قرآن کے حاملین کی بگڑی ہوئی حالت کو دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ دوسری قوموں کو اسلام کی طرف لے آئیں تو ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ان پر برہان قائم کریں، اس طرح کہ ہم اسلام کی صفات پر عامل ہوں۔ ورنہ ہم پورے مسلمان قرار نہیں پا سکتے۔

قرآنی تعلیمات کے فضائل کے بارے میں سید افغانی نے فرمایا: قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے سب سے پہلے فلسفیانہ طریق سے حقائق تک پہنچنے کا راستہ بتایا۔ قرآن کی بیشتر آیات میں اس طرح کے سوالات قائم کئے گئے ہیں: ایسا کیوں، ویسا کیوں۔ اور مخاطب سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس کا معقول جواب دے۔ اور فلسفہ اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں۔

انھوں نے کہا: قرآن کے اترنے سے پہلے عرب کے لوگ انتہائی پست حالت میں تھے۔ مگر ان پر ڈیڑھ سو سال بھی نہیں گزرے کہ انھوں نے اپنے وقت کی آباد دنیا کو فتح کر لیا۔ اور دنیا کی قوموں سے سیاست، علم، فلسفہ، صنعت تجارت ہر چیز میں بڑھ گئے، اور بخدا یہ سب کچھ قرآن کا کرشمہ تھا۔ قرآن تنہا پچھلی قوموں کو کھینچنے اور ان کو ہدایت پر لانے کے لئے کافی تھا۔ وہی آج بھی جدید قوموں کو کھینچنے اور ہدایت دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔

سید جمال الدین ایک بڑے عالم تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی ذات سے لوگوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی ساری توجہ سیاست کی طرف موڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صلاحیتیں ضائع ہو گئیں۔

مجھے حیرت ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمام اعلیٰ صلاحیت

کے مسلمانوں اور ان کے جرائد نے اپنی ساری توجہ سیاست
کی طرف موڑ دی اور تربیت وتعلیم کے کام کو چھوڑ دیا جو کہ
سب سے زیادہ اہم تھا اور جس پر تمام دوسری چیزوں کا
انحصار تھا۔

سید جمال الدین عجیب وغریب کمالات کے حامل
تھے۔ اگر انھوں نے اپنے آپ کو تعلیم وتربیت کے کام میں
لگایا ہوتا تو وہ اسلام کو بہت بڑا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ میں
نے یہ بات ان کے سامنے رکھی تھی جب کہ ہم پیرس میں تھے۔ یہ
کہ "ہم سیاست کو چھوڑ دیں اور حکومت کی نظروں سے دور
جاکر نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو دس
برس میں ہمارے پاس ایک ٹیم تیار ہو جائے گی اور وہ ساری
دنیا میں اصلاح وتبلیغ کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ
انجام دے گی۔" انھوں نے جواب دیا: "تم تو حوصلہ
پست کرنے والی باتیں کرتے ہو۔"
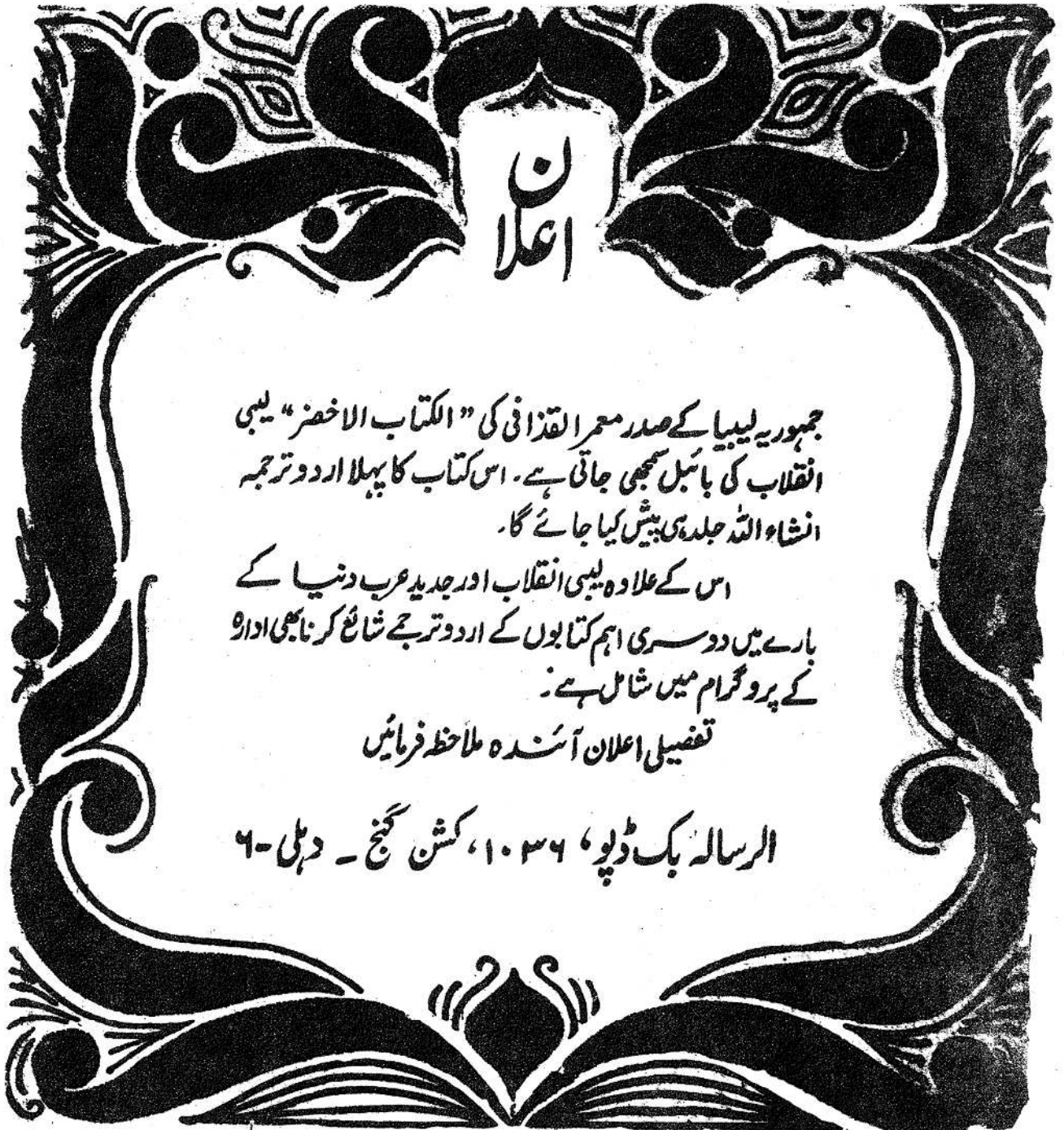
یہ کامیابی محض پُر جوش اقدام کا نتیجہ نہ تھی
بلکہ سوچے سمجھے منصوبہ کے ذریعہ حاصل کی گئی

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے" اس طرح کے الفاظ نے مسلمانوں میں ناعاقبت اندیشانہ اقدام کا ذہن پیدا کیا ہے۔ حالاں کہ خود اس شعر میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ ایک سوچی سمجھی پیش قدمی تھی نہ کہ محض ایک پر جوش چھلانگ۔

۱۶ھ میں اسلامی فوج سعد بن وقاص کی قیادت میں عراق کے علاقوں کو فتح کر رہی تھی۔ بہرہ شیر کو فتح کر کے جب وہ آگے بڑھی تو سامنے دریائے دجلہ تھا اور اس کے دوسری طرف مدائن جو ایرانیوں کا ایک اہم شہر تھا اور وہاں انھوں نے زبردست قلعہ بنا رکھا تھا۔ ایرانیوں نے بہرہ شیر سے بھاگتے ہوئے دجلہ کے پل کو توڑ دیا تھا اور دور تک کوئی کشتی بھی نہ چھوڑی تھی جس سے اسلامی لشکر دریا کو عبور کر سکے۔

سعد بن وقاص اگلے دن اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور یہ کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا:

نستعین باللہ ونتوکل علیہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم

ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ عظیم و برتر خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔

آپ کو دیکھ کر دوسروں کو بھی جرأت ہوئی اور پورا لشکر اپنے گھوڑوں کے ساتھ دریا میں تیرنے لگا۔ یہ لوگ نصف سے زیادہ دریا پار کر چکے تھے کہ ایرانی تیر اندازوں نے تیروں کی بارش شروع کر دی جو دریا کے دوسرے کنارے پہلے سے موجود تھے۔

دریا میں تیرتا ہوا لشکر اس ناگہانی آفت کا خود مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر کیا چیز تھی جس نے فوج کو برباد ہونے سے بچایا۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا اور نہ محض جوش کا کرشمہ تھا۔ یہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔ جو کچھ ہوا، وہ عین اس نقشہ کے مطابق ہوا جو پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔

صورت حال پیش آنے کے بعد سعد بن وقاص نے باقاعدہ مشورہ کیا۔ سعد بن وقاص جہاں نصرت الٰہی پر یقین کرتے ہوئے دریا میں کود پڑے، وہیں انھوں نے حالات کا مکمل جائزہ لے کر اس آنے والی آفت کا بھی پیشگی اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انھوں نے گھوڑا دریا میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو لشکریوں سے فرمایا کہ "تم میں کون ایسا بہادر سردار ہے جو اپنی جمعیت کے ساتھ اس بات کا وعدہ کرے کہ وہ ہم کو دریا عبور کرنے کے وقت دشمن کے امکانی حملہ سے بچائے گا۔ عاصم بن عمرو نے اس کی ذمہ داری لی اور چھ سو تیر اندازوں کی ایک جماعت لے کر دجلہ کے اِس کنارے ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ایرانی تیر اندازوں نے دجلہ میں تیرتے ہوئے اسلامی لشکر پر تیر پھینکنے شروع کئے، عاصم بن عمرو کا دستہ فوراً متحرک ہو گیا۔ اس نے ایرانی تیر اندازوں پر اتنی قوت کے ساتھ مسلسل تیر برسائے کہ انھیں دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا۔ کثرت سے ایرانی مجروح اور ہلاک ہونے لگے حتیٰ کہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس درمیان میں اسلامی لشکر دریا پار کر کے دوسرے کنارے پہنچ گیا اور ایرانی لشکر پر سخت حملہ کر کے مدائن پر قبضہ کر لیا۔

اختلاف کا نقصان کہاں تک جاتا ہے

عرب کے جزیرہ نما سے اسلام کا جو سیلاب اٹھا تھا، وہ اطراف کے تمام ملکوں پر اس طرح چھایا کہ ان کی زبان اور تہذیب تک بدل گئی۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ ایران کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اہم سوال ہے کہ وہ اسلام جس نے اپنے تمام پڑوسی ملکوں کی زبان اور تہذیب بدل دی، وہ ایران میں مذہبی تبدیلی کی حد تک کامیاب ہونے کے باوجود وہاں کی زبان کو کیوں نہ بدل سکا۔

اس سوال کا جواب ہم کو امویوں اور عباسیوں کی سیاسی لڑائی میں ملتا ہے۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت قائم کرنے کی تحریک جو دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اس میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو سیاسی عزائم کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔ اس گروہ کے سردار محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس بن مطلب تھے۔ دوسری طرف مذہبی لوگ تھے جو اصلاحی جذبہ کے تحت اس مہم میں شریک ہو گئے۔ عبد اللہ بن محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ محمد بن علی کے لڑکے ابراہیم ۱۲۴ ہجری میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اس تحریک کے "امام" مقرر ہوئے — ابو مسلم خراسانی جس نے عباسی سلطنت کے قیام میں اہم حصہ ادا کیا ہے، ایک معمولی مزدور تھا جو چارجامہ سینے کا کام کرتا تھا۔ اس کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی صلاحیت کو دیکھ کر امام ابراہیم نے اس کو اپنے کام کے لئے چن لیا اور اس کو اپنا نائب مقرر کر کے خراسان بھیج دیا۔

جب عباسیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے چن چن کر بنو امیہ کے افراد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ مستقبل میں ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی باقی نہ رہے۔ اس زمانے میں امام ابراہیم نے ابو مسلم کو تاکید کے ساتھ لکھا کہ "خراسان میں کسی عربی بولنے والے کو زندہ نہ رکھنا" خراسان میں بنو امیہ کے طرف دار وہی عرب قبائل تھے جو خراسان کی فتح کے بعد وہاں جاکر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ جو خراسانی باشندے تھے، وہ سب نو مسلم تھے اور با آسانی عباسی اقتدار کو قبول کر سکتے تھے۔ جب کہ عرب قبائل سے یہ اندیشہ تھا کہ ان کی عربیت انھیں بنو امیہ کا حامی بنا کر نئے ارباب اقتدار کے لئے مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

ابو مسلم ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے خود بھی اپنے ملک سے عربوں کے استیصال کا دل سے خواہش مند تھا۔ امام ابراہیم عباسی کی ہدایت پانے کے بعد وہ پوری طرح اس محبوب مہم کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اس نے خراسان میں آباد سارے عرب باشندوں کا ایک طرف سے صفایا کر دیا۔ یہ عرب قبائل جو اس وقت خراسان میں آباد تھے، دوسرے پڑوسی ملکوں کی طرح یہاں کی زبان، معاشرت تمدن کو عربی بنانے میں مصروف تھے۔ ان کے مذہب کو بدلنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب زبان اور تہذیب کو بدلنے کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری تھا، مگر ابو مسلم کی طرف سے ان کے قتل عام کے بعد یہ عمل یکایک رک گیا۔ ایرانی زبان اور ایرانی تہذیب مرتے مرتے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ ایران و خراسان جو مصر و شام و عراق وغیرہ کی مانند آج عرب دنیا کا ایک حصہ ہوتا۔ دوبارہ فارسی ملک بن گیا۔

تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیاسی حوصلہ مندوں کی سیاست بازیوں کی وجہ سے ضروری قسم کے تعمیری کام ہونے سے رک گئے جس کے نتائج بعد کو اندوہناک صورت میں برآمد ہوئے۔ چند افراد کے وقتی عزائم کی قیمت قوموں اور ملکوں کو صدیوں تک انتہائی بھیانک شکل میں دینی پڑی۔

سبق آموز

مغربی پاکستان کے سابق گورنر امیر محمد خاں (متوفی ۱۹۶۷ء) نے یورپ میں زرعی سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ صدر ایوب کی حکومت کے زمانہ میں پاکستان میں جو "سبز انقلاب" آیا تھا اس کا سہرا دراصل ملک امیر محمد خاں ہی کے سر ہے۔ جو اس وقت پاکستان کے غذائی وزرعی کمیشن کے صدر تھے اور بعد کو اپنی خدمات کے اعتراف میں گورنر بنا دیئے گئے۔ وہ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے گورنر ہاؤس میں نماز روزہ کی سختی سے پابندی کرتے اور ان کے گھر کی خواتین ہمیشہ پردہ کے اندر رہتیں۔

جب پاکستان کے تیسرے منصوبہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے لئے ۳۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ بات بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ صدر ایوب نے جھنجھلا کر کہدیا کہ اگر آبادی کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک وقت وہ آئے گا جب اناج کی کمی کی وجہ سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو بھون کر کھائے گا خوشی صرف اس بات کی ہے کہ اس وقت میں زندہ نہیں رہوں گا۔

ملک امیر محمد خاں نے ستمبر ۱۹۶۶ میں گورنری سے استعفاء دے دیا۔ اور اپنے آبائی وطن کالا باغ چلے گئے۔ جہاں ان کے کھیت اور باغات تھے۔ یہاں ان کے گھر پر جائداد کا جھگڑا شروع ہوا۔ بالآخر ایک روز وہ خود اپنے بیٹے ملک محمد اسد خاں کے خلاف رائفل لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے پر گولی چلائی مگر وہ کندھے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ اب بیٹے کی باری تھی۔ اس نے چھ گولیاں اپنے باپ کے جسم میں اتار دیں۔ اور وہ وہیں موقع پر ختم ہو گئے۔

وہ شخص جس نے خاندانی منصوبہ بندی کو ناجائز قرار دے کر گورنری کے عہدہ کو چھوڑ دیا تھا، بالآخر خود اپنے بیٹے کے خلاف بندوق لے کر کھڑا ہو گیا اگرچہ اس مقابلہ میں جوان بیٹا بوڑھے باپ پر غالب آیا اور نتیجہ برعکس شکل میں برآمد ہوا۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) نے اسّی برس پہلے اپنی کتاب الکلام میں لکھا تھا کہ "دوسری دنیا" کے وجود کو عقلی ذرائع سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے پہلے امام غزالی بھی یہی بات کہہ چکے ہیں مگر آج دوسری دنیا کا وجود اسی طرح ایک ثابت شدہ چیز بن رہا ہے جیسے ہماری موجودہ دنیا۔

اگلے صفحہ پر جو مضمون درج کیا جا رہا ہے، وہ ایک نمونہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید سائنس نے کس طرح ان مذہبی حقائق کو "عقلی طور پر" ثابت کر دیا ہے جن کو اس سے پہلے صرف قیاسی بحث کا موضوع سمجھا جاتا تھا۔

سائنس کے طریقوں سے حقیقت کی تلاش کرنے والے اب اس رائے پر پہنچ رہے ہیں کہ کائنات ایک جوڑے کی شکل میں ہے۔ ہماری دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا ہے جو اس کے متوازی اپنا وجود رکھتی ہے۔ وہ دنیا ہماری دنیا سے زیادہ پائدار ہے مگر چوں کہ وہ ہمارے ورلڈ کا اینٹی ورلڈ ہے، اس لئے یہ دوسری دنیا ہم کو موجودہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔

یہ ٹھیک وہی بات ہے جو قرآن میں ڈیڑھ ہزار برس پہلے بتا دی گئی تھی۔ قرآن نے کہا تھا کہ ہر چیز کو اللہ نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ تاکہ تم سوچو کہ جب ہر چیز کا جوڑا ہے تو اس دنیا کا جوڑا کہاں ہے جس سے مل کر وہ مکمل ہو سکے۔ (ذاریات - ۴۹)

دنیا کا یہ جوڑا (آخرت) ۲۵ سال پہلے تک صرف ایک قیاسی چیز تھی، اب جدید علم نے خالص سائنسی طریقوں سے اس کے وجود کو معلوم کر لیا ہے، اس طرح کی بے شمار دریافتیں ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں الحاد کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا ہے اور اگر ان کی مدد سے نیا علم کلام مرتب کیا جائے تو وہ قدیم علم کلام کے مقابلہ میں ایسا ہی ہوگا جیسے تلوار کے مقابلہ میں ایٹم بم۔

یہاں ایک اور مخفی دنیا ہے جو ہماری دنیا کے متوازی موجود ہے

۱۹۲۸ تک طبیعیات داں یہ سمجھتے تھے کہ تمام ایٹم صرف دو قسم کے ذرات کا مجموعہ ہوتے ہیں، مثبت برقی چارج رکھنے والے پروٹان اور منفی برقی چارج رکھنے والے الکٹران۔ مگر اسی سال پال اے ایم ڈیراک Paul A.M. Dirac نے، جو ایک انتہائی تخلیقی قسم کا ریاضیاتی طبیعیات داں تھا ذرات کا ایک نیا نظریہ پیش کیا اور ایک نئے قسم کے ذرّہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا جو اب تک تجرباتی طبیعیات دانوں کے لئے لامعلوم تھا

اس نے کہا کہ "اس کا مقدار مادہ الکٹران جیسا ہے۔ مگر وہ اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ ہم اس ذرہ کو اینٹی الکٹران کہہ سکتے ہیں"۔ ۱۹۳۲ میں یہ اینٹی الکٹران دریافت ہوگیا۔ اس کو کے، اینڈرسن (K. Anderson) نے کاسمک شعاعوں میں دریافت کیا اور اس کا نام پازیٹران رکھا گیا۔ یہ پہلا اینٹی پارٹیکل تھا جو انسان کے علم میں آیا۔ اس وقت سے اب تک ۳۵ سے زیادہ ایلمنٹری پارٹیکل ایٹم کے اندر دریافت ہو چکے ہیں اور اگر تمام نیوکلیر واقعات کو شمار کیا جائے تو یہ تعداد ۲۰۰ تک پہنچ جائے گی بشمول ان کے اینٹی پارٹیکل کے۔ کیونکہ ایٹم کے ہر پارٹیکل کا ایک اینٹی پارٹیکل ہے۔ پروٹان ایک اینٹی پروٹان رکھتا ہے۔ نیوٹران کا ایک اینٹی نیوٹران ہے اور اسی طرح دوسرے۔ صرف تین استثنار اب تک معلوم ہو سکے ہیں: فوٹون اور دو قسم کے میسان۔ مگر ان کی حیثیت خود اپنے ہی اینٹی پارٹیکل کی ہے۔

ذراتی جوڑوں (Pair Particles) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ جیسے ہی وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں وہ ایک دوسرے کو فنا کر دیتے ہیں۔ مگر فنا کا مطلب مادہ کا بالکل فنا ہو جانا نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلاسفہ غلطی سے سمجھتے ہیں۔ طبیعیات میں "فنا" کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ مادہ رکھنے والا ایلمنٹری پارٹیکل مادہ یا انرجی کی کسی دوسری صورت میں تبدیل ہو جائے۔ یہ پروٹان کی شکل میں ہو سکتا ہے جو کہ زیرو مادہ کی حالت میں رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک پازیٹران اور ایک الیکٹران ٹکراتے ہیں، وہ فی الفور ایک دوسرے کو فنا کر کے دو فوٹان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ نکلتا ہے کہ ایک ایٹم اور ایک اینٹی ایٹم کا ٹکراؤ نہایت زبردست مقدار میں انرجی خارج کرے گا۔ فی الواقع مادہ اور اینٹی مادہ کا فنا ہونا، یورینیم کے ذریعہ پیدا کی جانے والی انرجی کا ایک ہزار گنا اور تھرمونیوکلیر کا ۱۳۳ گنا زیادہ توانائی خارج کرتا ہے۔ ایک دن آدمی اس قابل ہو جائے گا کہ اس کبھی نہ ختم ہونے والے ذریعہ توانائی پر قابو پا لے۔

جب ایک بار اینٹی پارٹیکل کو مان لیا گیا اور ان کا وجود متحقق ہو گیا تو اس کے بعد فطری طور پر یہ ہوا کہ سائنسی فکر اینٹی نیوکلیس اور اینٹی ایٹم کی طرف مڑ گیا۔ ایک اینٹی ہائیڈروجن ایٹم میں منفی برقی چارج رکھنے والا ایک اینٹی پروٹان ہوگا اور اس کے گرد مثبت برقی چارج رکھنے والا الکٹران (پازیٹران) اس کے گرد گھوم رہا ہوگا۔ ڈیوٹریم، ہائیڈروجن کا ایک آئیسوٹوپ ہے جس کے نیوکلیس میں ایک پروٹان اور ایک نیوٹران ہوتا ہے۔ اب اینٹی ڈیوٹریم کا نیوکلیس ایک اینٹی پروٹان اور ایک اینٹی نیوٹران پر مشتمل ہوگا۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ سائنس داں اس قسم کا اینٹی ڈیوٹریم پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس طرح اینٹی آکسیجن، اینٹی آئرن وغیرہ کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ فطری طور پر اس کے بعد دوسرا قدم اینٹی میٹر اور اینٹی ورلڈ ہے

ہماری دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (Unstable)
حالت میں ہیں، مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (Stable)
حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی
چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔
اینٹی ورلڈ کی موجودگی کوئی بعید از قیاس بات نہیں درحقیقت
اس قسم کے ایک اینٹی ورلڈ کے موجود ہونے کا امکان پہلی بار
۱۹۳۳ء میں ڈیراک نے اپنے لکچر میں بیان کیا تھا مگر اب
تک کوئی سائنس داں اس کی نشان دہی نہیں کرسکا۔

اس راہ کی مشکلات کیا ہیں۔ اپنی دنیا میں دور کی چیزوں
کو ہم فوٹان کی مدد سے پہچانتے ہیں جو کہ برقی مقناطیسی شعاعوں
کے ذرات ہیں۔ اینٹی ورلڈ، اگر اس کا وجود ہے تو وہ بھی اسی قسم کے فوٹان
کا اخراج کرتی ہوگی جو کہ بیک وقت پارٹیکل بھی ہیں اور اینٹی
پارٹیکل بھی۔ اینٹی ورلڈ، وہ دور ہو یا نزدیک، اس کی روشنی
فوٹان کی شکل میں ہوسکتا ہے کہ مسلسل ہم تک پہنچ رہی ہو۔
مگر ہم اس کو اپنے پازیٹو ورلڈ کی چیزوں کی روشنی سے الگ کر کے
نہیں دیکھ سکتے۔ اصولی طور پر نیوٹرینو کو ہمیں اینٹی ورلڈ کو جاننے
میں مددگار ہونا چاہئے۔ مگر یہ نیوٹرینو نیز اینٹی نیوٹرینو بہت
زیادہ گریز صفت ذرات ہیں اور ان کو پکڑنا انتہائی مشکل ہے۔

بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے
الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ اگر کائنات
صرف پارٹیکل اور اینٹی پارٹیکل کے حساب سے اضافی نہیں ہے
بلکہ میٹر اور اینٹی میٹر کے حساب سے بھی اضافی ہے تو ایک نیا
اینٹی میٹر سے ترکیب یافتہ موجود ہونا چاہئے۔ تخلیق کے بارے
میں عظیم دھماکہ (Big Bang) کا نظریہ فرض کرتا ہے کہ
تقریباً ۱۰ سے ۲۰ بلین سال پہلے سارا مادہ منجمد حالت میں
ابتدائی ایٹم کی شکل میں تھا اور فوٹان انرجی پر مشتمل تھا۔ اگر
کائنات واقعی متناسب ہے تو عظیم دھماکہ کے ساتھ فوٹان، میٹر
اور اینٹی میٹر کی صورتوں میں مجتمع ہو گئے ہوں گے اور ورلڈ اور اینٹی
ورلڈ کو بنانے کے لئے الگ الگ ہو گئے ہوں گے۔ یہ نظریہ پہلے سویڈش
طبیعیات داں اوسکر کلین (Oskar Klein) نے پیش کیا
تھا۔ اس کے بعد اس کی بنیاد پر مشہور طبیعی فلکیات داں ہینز الفوین
(Hannes Alfver) نے ۱۹۶۲ء میں ایک تفریقی میکانزم
کا امکان ظاہر کیا جس کے ذریعہ ایک ہی کہکشاں میں میٹر اور
اینٹی میٹر دونوں موجود رہتے ہیں۔ مگر ابھی تک تفریقی میکانزم کا
کوئی طریقہ وضع نہیں ہوسکا ہے جس کے مطابق ہماری کسی معلوم
کہکشاں کے قریب کوئی اینٹی کہکشاں موجود ہو یا ہماری دنیا سے
متصل کوئی اینٹی دنیا پائی جاتی ہو۔

اب تک ہم نے ایک ایسا اینٹی ورلڈ پر غور کیا ہے جس میں صرف
مادہ منفی ہوتا ہے۔ یہ ڈیراک کا اینٹی ورلڈ ہے۔ مگر جیسا کہ ہم جانتے
ہیں، تمام مادہ، تمام اجسام مکاں میں حرکت کرتے ہیں اور زماں
میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ ہماری دنیا میں یہ تینوں اجزاء ——
مادہ، مکان اور زماں —— مثبت ہیں۔ ڈیراک کے اینٹی ورلڈ
میں جس کو ہم تلاش کر رہے ہیں، صرف مادہ منفی ہوگا جبکہ مکاں
اور زماں مثبت ہوں گے۔ مگر الجبرا کے عمل کی منفی مقداروں
کی طرح ہم منفی زماں اور منفی مکاں کے امکانی وجود کو بھی سوچ
سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں تینوں اجزاء —— مکاں، زماں اور
مادہ —— اینٹی ورلڈ کے سات الگ وجود بنائیں گے ہماری مثبت
دنیا (پازیٹو ورلڈ) کو ملا کر کل تعداد آٹھ ہو جائے گی۔ اینٹی ورلڈ
کے سات وجودوں میں سے ایک، جس میں مکاں، زماں اور مادہ
سب منفی ہیں، بظاہر سب سے زیادہ یقینی اینٹی ورلڈ ہے۔

سوویت یونین کے ڈاکٹر گستاف نان Gustav Naan
نے اس مکمل طور پر منفی اینٹی ورلڈ کی ریاضیات کے ذریعہ ایسی
ٹھوس احاطہ بندی کردی ہے کہ اس کے مخالفین تک اس کو
انتہائی زبردست قسم کا متوازن تصور مانتے ہیں۔ ڈاکٹر نان کے
اینٹی ورلڈ میں ہر چیز —— مکان، زماں اور مادہ —— ایک دوسرے
کے مخالف سمت میں بھاگ رہے ہیں۔ نظریاتی طور پر یہ ناممکن

مقناطیس کا ہر ٹکڑا اپنے دونوں سروں پر ایک دوسرے کی ضد ہوتا ہے۔ ایک سرے کو ساؤتھ پول (قطب جنوبی) اور دوسرے سرے کو نارتھ پول (قطب شمالی) کہتے ہیں۔ مقناطیس کے دو ٹکڑے لیجئے۔ اگر آپ دونوں کے ساؤتھ پول کو آمنے سامنے کریں تو وہ ایک دوسرے سے بھاگیں گے اور اگر ایک کا ساؤتھ پول دوسرے کے نارتھ پول کے سامنے لائیں تو وہ ایک دوسرے سے چمٹیں گے ــــــ حیوانات کے نر و مادہ سے لے کر ایٹم کے مثبت اور منفی ذرات تک ہر جگہ یہی اصول جاری ہے۔ ہر چیز اسی لئے "ایک" ہے کہ وہ "دو" ہے، اگر دو نہ ہو تو ایک بھی نہیں۔

نہیں۔ اس قسم کے اینٹی ورلڈ میں وہی طبیعیاتی قوانین، بالفاظ دیگر فطرت کے قوانین، منطبق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم موجودہ دنیا میں جانتے ہیں۔ یہ انقلابی قسم کا اینٹی ورلڈ کہاں ہے۔ کیا وہ آج موجود ہے، کیا وہ "عظیم دھماکہ" کے ابتدائی ایٹم سے پہلے موجود تھا۔ اس ایک اینٹی ورلڈ کی موجودگی کو ہم بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جس میں، قبل اس کے کہ وہ ابتدائی ایٹم کی صورت میں منجمد ہوا، ہر چیز الٹی شکل میں تھی۔ تب ایک انقلاب عظیم برپا ہوا زماں رک گیا اور اینٹی ورلڈ نے پازیٹو ورلڈ کی صورت اختیار کی جو کہ آج ہماری دنیا ہے۔

اس قسم کی ایک صورت حال کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ مگر ڈاکٹر نان کا کہنا ہے کہ اس کو طبیعیات کے معلوم نظریات اور قوانین کے ذریعہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا یقین ہے کہ وہ مختلف دنیا آج بھی موجود ہے مگر وہ ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ کیا کوئی مواصلاتی سلسلہ ہے جس کے ذریعے سے ہماری دنیا اینٹی ورلڈ سے تعلق قائم کرتی ہے۔ مادہ اور انرجی لاشے (Nothing) سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر مٹ جائیں۔ مگر ایک "بلیک ہول" کے بارے میں غور کرو۔ بلیک ہول ایک ختم شدہ ستارہ ہے جس کی طاقت ور کشش ثقل اس کی روشنی تک کو نکلنے سے روک دیتی ہے اور اس طرح اس کو ناقابل دید بنا دیتی ہے۔ اب تک کوئی بلیک ہول مثبت طور پر شناخت نہیں کیا جاسکا ہے۔ مگر بہت سے فلکیات داں یقین رکھتے ہیں کہ کویسار (Quasars) پلسار (Pulsars) درحقیقت بلیک ہول ہیں جو گیسوں کی ایکسرے شعاعوں کے پھٹنے سے اپنے وجود کو بتا رہے ہیں۔

امکانی طور پر کائنات میں وھائٹ ہول بھی ہیں۔ ان کے ذریعہ سے مادہ یا شعاعیں بالکل غیر متوقع طور پر خلا میں بکھر سکتی ہیں۔ مگر کیا بلیک ہول اور وھائٹ ہول میں کوئی رشتہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی سلسلہ ہو جو دونوں کو جوڑ رہا ہو۔ ممکن ہے کہ جو مادہ ایک بلیک ہول سے غائب ہو جاتا ہے، وہ دوبارہ ایک وھائٹ ہول میں ظاہر ہو جاتا ہو۔ ڈاکٹر نان کا خیال ہے کہ بلیک اور وھائٹ ہول کو ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان ایک مقامی واسطہ سمجھنا چاہئے۔ مگر اب تک یہ سب کچھ مفروضہ ہے۔ نان کے اینٹی ورلڈ میں منفی انرجی رکھنے والے اجسام مخالف زمانی رخ پر سفر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک زمان معکوس کی کائنات ہے۔ شاید یونیورس اور اینٹی یونیورس دونوں ایک دوسرے سے بندھی ہوئی اور باہم متعلق ہیں۔ ہر دنیا دوسری دنیا کے مقابلہ میں ایک اینٹی ورلڈ ہے۔ یہ ایک قسم کا اتحاد اور باہمی نفی اور اتحاد اور اپنے مخالف سے مقابلہ کی صورت ہے۔ کائنات سکڑتی ہے اور پھیلتی ہے اور یہی کائنات کے واقعات کا اصل سرچشمہ ہے۔

ویکلی لنک، ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۵

جب تعمیری حوصلے سیاسی عزائم میں تبدیل ہو جائیں

ابو علی محمد بن علی بن مقلہ (۳۲۸ - ۲۷۲ھ)

ایک غیر معمولی صلاحیت رکھنے والا فن کار تھا۔ اس نے قدیم عربی خط (خط کوفی) میں اصلاحات کر کے اس کو حسین اور جامع بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ابتدا میں وہ عباسی حکومت کے ایک دفتر میں چھ دینار ماہوار پر منشی تھا۔ پھر اس کا فنی کمال اس کو خلیفہ کے دربار تک لے گیا۔ یہاں اس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مسلسل تین بادشاہوں کا وزیر بنتا رہا۔ اولاً مقتدر باللہ عباسی (۳۲۰ - ۲۸۲) کا، پھر اس کے بھائی قاہر باللہ (۳۲۲ -) کا، اس کے بعد راضی باللہ (۳۲۹ - ۲۹۷) کا۔ واضح ہو کہ "وزیر" قدیم زمانے میں وزیر اعظم کے ہم معنی ہوتا تھا۔ کیونکہ بادشاہ کا صرف ایک وزیر ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے مقتدر باللہ کے ابتدائی زمانے میں حامد بن عباس وزیر تھا۔ اس کے ساتھ اس نے علی بن عیسٰی الجراح کو نائب وزیر بنایا تو لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایک شاعر کی نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

اعجب من کل ما رأینا

ان وزیرین فی بلاد

سب سے عجیب بات جو ہم نے دیکھی

وہ یہ کہ ایک ملک میں دو وزیر ہیں

ابن مقلہ کے یہ مناصب اس کے فن کی ترقی میں بے حد مددگار ہو سکتے تھے۔ اگر ان ملے ہوئے مواقع کو وہ فن تحریر اور اس سلسلے کی دوسری چیزوں کی ترقی اور تحقیق میں لگاتا تو نہ صرف یہ کہ عربی رسم الخط بہت پہلے اپنے معراج کمال کو پہنچ جاتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تحریر اور کتابت کے میدان کی بہت سی دوسری ایجادیں جو اس کے بہت بعد سامنے آئیں اسی کے زمانے میں وجود میں آگئی ہوتیں۔ مثال کے طور پر کاغذ ابن مقلہ سے آٹھ سو برس پہلے ۱۰۵ء میں چین میں ایجاد ہوا۔ اس کا ایجاد کرنے والا سائی لون تھا جو ابن مقلہ کی طرح چینی شہنشاہ ہوٹی کا وزیر تھا۔ روسی ترکستان میں عربوں اور چینیوں کی جنگ میں کچھ چینی قیدی جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ کاغذ بنانا جانتے تھے۔ سمرقند میں ان سے کاغذ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ۷۹۵ء میں دستی کاغذ کی صنعت بغداد میں قائم ہوئی۔ تاہم مشین کے ذریعے کاغذ بنانے کا کام پہلی بار ۱۶۸۰ء میں ہالینڈ میں کیا گیا۔ مسلسل رول کی شکل میں کاغذ بنانے کی صنعت ۱۷۹۸ء میں فرانس میں شروع ہوئی۔ اسی طرح پرنٹنگ پریس پہلی بار غالباً چینیوں نے ۷۷۰ء میں دریافت کیا۔ یہ ابن مقلہ (۹۴۰ - ۸۸۵ء) کی پیدائش سے ۱۱۵ سال پہلے کا زمانہ تھا۔ پرنٹنگ کا قدیم ترین نمونہ اس سے بھی پہلے پانچویں صدی عیسوی کا چین میں دریافت ہوا ہے۔ یورپ میں ترقی یافتہ پرنٹنگ پریس ۱۵ ویں صدی میں گوٹن برگ نے بنایا اور بائبل چھاپی۔ تاہم مسلم دنیا میں پرنٹنگ پریس نپولین کے ذریعے ۱۷۹۸ء میں پہلی بار مصر پہنچا۔

ابن مقلہ جو نہ صرف فن تحریر کا ماہر تھا بلکہ حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے میدان میں لگاتا تو کاغذ اور چھپائی اور اس طرح کی دوسری نعمتیں جو عالم اسلام کو بہت بعد کو ملیں شاید ابن مقلہ کے زمانہ ہی میں اس کو مل چکی ہوتیں۔ مگر وہ اس پر قانع نہ رہ سکا کہ اپنے آپ کو مخصوص میدان میں محدود رکھے۔ وزارت کے ملے ہوئے مواقع کو وہ تحریر اور کاغذ اور چھپائی کی ترقی میں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ان مواقع کو عزت و ناموری کی طرف چھلانگ لگانے کے لئے ایک زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ ابن مقلہ جب وزیر کے منصب پر پہنچ گیا تو اس کے ساتھ وہی حادثہ ہوا جس سے وہ لوگ بہت کم بچتے ہیں جن کو حالات کسی بلند مقام پر پہنچا دیں۔ اس کے فنی حوصلے اب سیاسی

عزائم میں تبدیل ہو گئے۔ خاموش تعمیری کاموں میں مشغول رہنے کے بجائے وہ سیاسی اور فوجی تحریکوں کا لیڈر بن گیا اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ خلیفہ قاہر باللہ کو تخت سے اتار کر ابو احمد بن مکتفی کو عباسی سلطنت کا حکمراں بنا دیا جائے۔
راز کھل گیا۔ ابن مقلہ پر یہ الزام لگا کہ اس نے فوجی سردار مونس خادم کے ساتھ مل کر قاہر باللہ کی حکومت کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔ سازش کے انکشاف کے بعد ابن مقلہ کا گھر جلوا دیا گیا۔ ابو احمد بن مکتفی کو دیوار میں چن دیا گیا۔ تاہم ابن مقلہ کی ذہانت اس کے کام آئی۔ وہ فرار ہو کر بچ گیا اور اس کے بعد پانچ لاکھ دینار خلیفہ کو نذر کر کے دوبارہ وزارت حاصل کر لی۔ مگر اس کے سیاسی عزائم نے دوبارہ اس کے لئے مسائل پیدا کئے۔ یہاں تک کہ راضی باللہ نے اس کو وزارت سے معزول کر کے اس کے گھر میں نظر بند کر دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ بلاشبہ یہ ایک سخت ترین سزا تھی جو کسی فن کار کو دی جا سکتی تھی۔ گھر کی قید میں جو اشعار وہ پڑھا کرتا تھا۔ اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

لیس بعد الیمین لذۃ عیش
یا حیاتی بانت یمینی فبینی

دایاں ہاتھ کٹ جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں، اے میری زندگی جب میرا دایاں ہاتھ مجھ سے جدا ہو گیا تو تو بھی جدا ہو جا۔

ابن مقلہ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کی۔ یہاں تک کہ بائیں ہاتھ سے بھی وہ اتنا ہی اچھا لکھ لیتا تھا جیسا وہ دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں ایک قلم باندھا اور اس سے لکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ہاتھ کٹنے سے پہلے کے خط اور ہاتھ کٹنے کے بعد کے خط میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باکمال انسان اپنے گھر کے قید خانے میں ۵۶ سال کی عمر میں مر گیا۔

ابن مقلہ شاعر بھی تھا۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کے ماتم میں بہت سے اشعار موزوں کئے۔ وہ کہتا تھا: "وہ ہاتھ جس نے قرآن کے فلاں فلاں نسخے لکھے، جس نے رسول اللہ ﷺ کی فلاں فلاں حدیثیں لکھیں، جس نے مشرق و مغرب میں احکام لکھ کر بھیجے وہ چوروں کے ہاتھ کی طرح کاٹ دیا گیا۔"

ماضی کے ابن مقلہ کو تاریخ معاف کر سکتی ہے، مگر حال کے "ابن مقلہ" جو اپنے مناصب کو تعمیری جد و جہد میں نہیں لگاتے بلکہ اشتہاری قسم کے ذاتی عزائم میں اپنے قیمتی مواقع کو برباد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس دوسری بار اس اندوہناک غلطی میں مبتلا ہونے کا کیا عذر ہے۔ کیا انھیں یاد نہیں کہ مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔

پتھرائے ہوئے درخت

پانڈیچری سے ۲۴ میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے ترووکاری۔ یہاں قدیم زمانہ سے درختوں کے تنے کی شکل کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ عوام کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں یا راکششوں کی ہڈیاں ہیں جن کو وشنو بھگوان نے ہلاک کیا تھا۔ حال میں ماہرین نے دریافت کیا کہ یہ دراصل فاسلس (FOSSILS) ہیں۔ یعنی قدیم زمانہ کے درختوں کے پتھرائے ہوئے تنے۔ اندازہ ہے کہ یہ درخت ۲۰ ملین سال پہلے پائے جاتے تھے۔ اس قسم کا ایک شجری فاسل نومبر ۱۹۷۶ء میں نئی دہلی لایا گیا اور یہاں نیشنل میوزیم میں عام نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔

قدیم زمانے میں لوگ ان پتھرائے ہوئے درختوں کے پاس جانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں بھوت انھیں پکڑ نہ لیں۔ اب وہ تاریخ فطرت کے ایک صفحہ کی حیثیت سے ان کو دیکھیں گے اور ان سے زمین کے قدیم حالات کا اندازہ کریں گے

مفتی محمد عبدہ

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاست کی نذر ہوگیا آخر میں انھوں نے تعمیری کام کرنا چاہا مگر اب موت کا وقت آپہنچا تھا۔

مفتی محمد عبدہ (۱۹۰۵ — ۱۸۴۹) اپنے وقت میں مصر کے مشہور ترین عالم تھے۔ اسلامی علوم کی تمام شاخوں میں انھیں غیر معمولی درک حاصل تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ چالیس سال کی عمر میں فرانسیسی زبان بھی سیکھی اور اس میں بخوبی قدرت حاصل کرلی۔ وہ زندگی بھر جمال الدین افغانی کے کاموں میں ان کے دست راست رہے۔ بڑی بڑی سیاسی شخصیتیں مثلاً ریاض پاشا (وزیر مصر) سعد زاغلول (وزیر اعظم مصر) ان سے متاثر تھے۔ ساڑھے تین سالہ جلاوطنی کے بعد ۱۸۸۸ میں جب خدیو توفیق پاشا نے ان کو دوبارہ مصر میں داخل ہونے کی اجازت دی تو ان کی سفارش کرنے والوں میں لارڈ کرومر (۱۹۱۷ - ۱۸۴۱) بھی شامل تھے۔

۱۸۸۰ میں وہ حکومت مصر کے سرکاری ترجمان "الوقائع المصریہ" کے مدیر مقرر ہوئے تو انھیں یہ خصوصی اختیار دیا گیا کہ حکومت کے محکموں کی کارکردگی پر تنقید کریں۔ حالاں کہ اس سے پہلے یہ رسالہ صرف سرکاری اطلاعات اور حکومت کے محکموں کے اعلانات کی اشاعت کا ذریعہ تھا۔ انھیں شعبۂ اشاعت کے اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے ملک میں شائع ہونے والے تمام اخبارات پر نگرانی کا اختیار حاصل تھا۔ ۱۸۹۴ء میں جامعہ ازہر کی اصلاح کے لئے ایک اعلیٰ اختیار رکھنے والی کمیٹی بنی تو مفتی محمد عبدہ اس کے روح رواں تھے۔ ازہر کے نظام کو تبدیل کرنے میں ان کو حکومت کا پورا تعاون حاصل تھا۔ مجوزہ اصلاحات کی قیمت ادا کرنے کے لئے سرکاری خزانہ سے ایک ہزار پاؤنڈ سالانہ کی رقم منظور کرانے میں بھی انھوں نے کامیابی حاصل کرلی۔ ازہر کے اوقاف کو درست کرنے میں انھیں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اس کی سالانہ آمدنی چار ہزار پونڈ سے بڑھ کر تقریباً ۱۵ ہزار پونڈ ہوگئی۔ ۱۸۹۹ میں وہ مصر کے مفتی مقرر ہوئے تو ان کی شخصی عظمت کی وجہ سے یہ عہدہ نئی اہمیت کا مالک بن گیا۔ اس سے پہلے مفتی کا عہدہ حکومت کے مشیر قانون کے ہم معنی تھا۔ بجز ان امور کے جن کی بابت سرکاری محکمے مسئلہ دریافت کرتے یا قانونی مشورہ طلب کرتے، مفتی کسی معاملے میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ مگر انھوں نے عام اہل ملک کو شرعی امور میں مشورہ دینا شروع کردیا۔ اس طرح وہ عہدہ جس کی پہلے کوئی اہمیت نہ تھی بڑے اثر واقتدار کا ذریعہ بن گیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے وقت کی فضا کے علی الرغم بعض بڑے انقلابی فتوے دیئے۔ مثلاً یہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔ اسی طرح ڈاک خانوں کے سیونگ بنک میں روپیہ رکھنے اور اس سے سود لینے کا جواز۔ مصر کی محاکم شرعیہ (وہ عدالتیں جو نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کی بابت شرعی فیصلے کرتی تھیں) کی کارکردگی کی تحقیقات کرائی گئی تو حکومت نے انھیں اس سلسلے کے کامل اختیارات دیدیئے۔ ۱۸۹۹ میں وہ مجلس قانون ساز کے مستقل رکن منتخب ہوئے۔ اپنی قوت تقریر اور قانونی صلاحیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مجلس پر چھاگئے۔ ان کی رائے ہمیشہ مجلس کے اندر وزن کی مالک ہوتی تھی۔

مفتی محمد عبدہ فطری طور پر ایک اعتدال پسند شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ شیخ درویش نامی ایک صوفی کے گہرے عقیدت مند ہوگئے تھے جنھوں نے شیخ سنوسی سے طرابلس میں فیض حاصل کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ اپنا بیشتر وقت صوفیانہ مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ موٹے قسم کے کپڑے پہنتے اور معمولی غذا کھاتے تھے۔ ہمیشہ آنکھیں نیچی کئے ہوئے راستہ

چلتے اور کسی سے اس وقت تک بات نہ کرتے جب تک شدید ضرورت پیش نہ آئے۔ ان کے اس دور کی یادگار ان کی کتاب رسالات الواردات ہے جو ۱۸۷۴ میں شائع ہوئی۔

۱۸۶۹ میں جب سید جمال الدین افغانی قاہرہ آئے تو کچھ نوجوانوں کے ساتھ محمد عبدہ کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جمال الدین افغانی ایک آتشین شخصیت کے آدمی تھے۔ محمد عبدہ ان سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ جرجی زیدان کے الفاظ میں "انھوں نے جمال الدین افغانی کی مضطرب روح اپنے اندر جذب کرلی" اس تاثر نے انھیں تصوف اور ادب سے نکال کر سیاست کی راہ پر ڈال دیا۔ اعرابی پاشا کی بغاوت کے وقت انھوں نے فتویٰ دیا کہ خدیو کی بیعت فسخ کرنا جائز ہے۔ اس فتوے کی وجہ سے ان کو مصر سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے اس دور کے مضامین کا مقصد غیر ملکی مداخلت کے خلاف عوام کو اکسانا تھا۔ انھوں نے آزادی کے حصول کو قومی زندگی کا بنیادی مقصد قرار دیا اور جمہوریت اور آزادی کی حمایت میں پُرجوش مقالے لکھے۔ جمال الدین افغانی کے انتقال کے بعد اگرچہ ان کے خیالات میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ اب ان کا خیال یہ ہوگیا کہ جو امور ہمارے اختیار میں ہیں ان کی انجام دہی میں لگنا چاہئے اور جو امور ہماری طاقت سے باہر ہیں مثلاً سیاست جس میں انگریزوں کو بے پناہ مادی اور فوجی تفوق حاصل ہے خدا پر چھوڑ کر اپنی دینی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح پر توجہ مرکوز کر دینا چاہئے۔ مگر اپنی سابقہ طبیعت کی وجہ سے اب بھی کبھی کبھی ان کی تحریر تقریر میں سیاست کا رنگ آجاتا، جس کی وجہ سے حکمران طبقہ کو موقع ملتا کہ وہ حال کے محمد عبدہ کو ماضی کے محمد عبدہ کی روشنی میں دیکھے اور ان کے خلاف احتیاطی کارروائی کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے مواقع ملنے کے باوجود وہ تسلسل کے ساتھ کسی ایک کام کو عرصہ تک نہ کر سکے۔

مفتی محمد عبدہ جامعہ ازہر کو عالم اسلامی کی اصلاح کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ مگر ۱۹۰۵ء میں انھوں نے جامعہ ازہر کی انتظامی کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اب ان کا خیال تھا کہ بطور خود کسی نئے اصلاحی ادارہ کا قیام عمل میں لائیں۔ اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال ہو چکی تھی۔ مصر کے ایک بڑے رئیس نے جو ان کی تجویز سے ہمدردی رکھتا تھا اپنی زمین کا ایک معقول قطعہ ان کے لئے وقف کر دیا اور مجوزہ ادارہ کا خاکہ بھی تیار ہونا شروع ہوگیا۔ مگر جولائی ۱۹۰۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی نامکمل تفسیر قرآن کی طرح ادارہ کی تشکیل بھی ناتمام رہ گئی۔

مفتی محمد عبدہ کے ذہن میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ایک مشترک کمپنی بنائی جائے اور وہ ایک اعلیٰ معیار کا عربی روزنامہ جاری کرے۔ اس کی مجلس ادارت میں انتہائی لائق افراد لئے جائیں اور اس کو ملک کی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک خالص تعمیری پرچہ ہو۔ اور اس کو سیاسی باتوں سے بالکل پاک رکھا جائے۔ مگر موت کی وجہ سے یہ ارادہ بھی پورا نہ ہوسکا ـــــ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاسیات کی نذر ہوگیا۔ آخر میں جب ہوش آیا اور انھوں نے تعمیری کام کرنا چاہا تو موت کا وقت آپہنچا تھا۔

مفتی محمد عبدہ کی وفات پر ای۔ جی براؤن نے اپنے پیغام میں کہا تھا "موجودہ زمانے میں ان کا سا شخص نہ مغرب میں پیدا ہوا، نہ مشرق میں۔" جرجی زیدان نے ان کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا "قوموں کی تاریخ میں، خواہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہو ایسے افراد کم نظر آتے ہیں جن کی سرگرمیوں کا پیمانہ اتنا وسیع ہو جتنا کہ محمد عبدہ کے اصلاحی کاموں کا تھا" ایک ایسی شخصیت کا جو آخری انجام ہوا اس پر ان کے ایک معاصر کے الفاظ صادق آتے ہیں ـــــ "اس دن کے طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ دنیا سے کوچ کر گئے جس کے طلوع کے لئے ان کی بے تاب فطرت سراپا انتظار تھی۔"

وہ خطاط بھی ہیں اور فن خطاطی کے تاریخ نگار بھی

ہر دور میں کچھ ایسے فن کار پیدا ہوتے رہے ہیں جو اپنے بعد ہمیشہ کے لئے اپنا فنی شاہکار چھوڑ جاتے ہیں ۔ استاد عیسیٰ آفندی اور مکرمت خاں شیرازی نے تاج محل کا آرکیٹکچر تخلیق کرکے دائمی شہرت حاصل کرلی ۔ اسی طرح احمد معمار نے جامع مسجد شاہجہانی دہلی کا ڈیزائن بنایا جو زندۂ جاوید شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ عبدالحق شیرازی نے تاج محل کی محرابوں کی کتابت کرکے دنیا کو دائمی طور پر حیرانی میں ڈال دیا ۔

ایسے لوگ اکثر اپنے زمانے میں گمنام ہوتے ہیں بعد کو دنیا ان سے باخبر ہوتی ہے ۔ ایسی ہی ایک شخصیت سید احمد رام پوری (۵۱ سال) کی ہے جو خطاط اور آرٹسٹ ہونے کے ساتھ قدیم اسلامی تعمیری آرٹ کے دلدادہ ہیں ۔ بڑے بڑے آرکیٹکٹ جو اسلامی تعمیرات کا کام شروع کرتے ہیں ، وہ عمارت کی فنی آراستگی کے سلسلے میں سید صاحب کو بلا کر ضرور مشورہ کرتے ہیں اور ان کے ماہرانہ مشوروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

الخدمات الاستشاریۃ الہندسیۃ کے چیف آرکیٹکٹ مسٹر پارتھا گھوش ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

"مسٹر سید احمد اسلامی تعمیری کام میں ہمارے بہت بڑے معاون ہیں وہ قدیم تعمیری سجاوٹ کے بہترین مشورہ دینے والے اور اس کو خود کرکے دکھانے والے ہیں"

ایک تحریر میں سلطان مسقط کی شاہی عمارات کے ڈائرکٹر لکھتے ہیں : "مسٹر سید احمد نے اسلامی تعمیری انداز کے جدید اور قدیم اسلوب کے بارے میں ہمارے

ڈپارٹمنٹ کو جو مفید مشورے دیئے ہیں اور خطاطی اور عربی ڈیزائن کا کام جس طرح انجام دیا ہے وہ بلادِ عرب کے لوگوں کی نگاہ میں قابلِ صد مبارک باد ہے۔"

اسیما آرکٹکٹ کے روح رواں مسٹر ایم۔ یو۔ خان تحریر فرماتے ہیں: "سید احمد اپنے بعد اس دنیا میں ایسے فنی نقوش چھوڑ کر جائیں گے جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے حیرت کا سبب ہوں گے۔" آگے لکھتے ہیں: حضرت بل کی طویل ترین عبارت جس کی لمبائی ۴۸ فٹ آٹھ انچ اور چوڑائی ۲ ½ فٹ تھی، اس پر جب اسمار باری تعالیٰ لکھے گئے اور دور سے دیکھا تو گمان گزرا عبدالحق شیرازی دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔"

سید احمد رام پوری چند برسوں سے عربی خط کے ماخذ کے موضوع پر ایک تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اس میں وہ بتانا چاہتے ہیں کہ موجودہ عربی خط کتنی کروٹوں اور اشتقاق کے بعد ہم تک موجودہ صورت میں پہنچا ہے۔ وہ رات دن اس کے مطالعہ میں اور مضامین اور خط کے ہزاروں نمونوں کی تیاری میں دنیا و مافیہا سے بے خبر لگے رہتے ہیں۔ وہ ہر قدیم عمارت میں جا کر ان کی عبارتوں کو پڑھتے ہیں اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ عربی خط کی تاریخ پر ان کی کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف قدیم و جدید خطوط کے ڈیزائن کرنے میں ان کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ ان صفحات میں ہم سید صاحب کی کتاب کے خط کے دو نمونے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ ایک نمونہ خط کوفی مالبس کا ہے، اور دوسرا ثلث کے طغری کے انداز کا۔ محض اپنے شوق کے تحت اس طرح کے فنی کام میں اس طرح مسلسل لگے رہنے کی مثال بہت کم ملے گی۔

سید احمد صاحب فنِ خطاطی کی تاریخ اور قدیم اسلامی آرٹ کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ آپ ان کے سامنے کسی بھی زمانہ کی تعمیرات اور خطاطی کا ذکر کریں وہ آپ کے سامنے قدیم فنی کمالات کے حیرت انگیز انکشافات کریں گے، خواہ وہ گفتگو قصر الحمرا پر ہو یا تاج محل آگرہ پر۔ ترمذ اور خیوا کی اسلامی عمارات ہوں یا دہلی کی قدیم اسلامی تعمیرات، ان سب کے آرکٹکچر، کنسٹرکشن اور ڈیکوریشن کے بارے میں ڈیزائن کے ذریعہ آپ کو مطمئن کر دیں گے۔ سید احمد صاحب ہمہ وقت انھیں چیزوں کی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے حلیہ کو دیکھ کر کوئی بھی نفسیاتی ماہر ان کو فن کار یا محقق نہیں کہہ سکتا۔ وہ سیدھا سادا لباس پہنتے ہیں اور دنیا کی بھیڑ سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔

ان کا دعویٰ ہے کہ کسی بھی دور کا عمارتی تزئین کا کام ہو وہ اس کو خود کر کے دکھا سکتے ہیں۔ سید احمد صاحب ہندوستان میں گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس قدر عظیم ہیں۔ وہ وقت نزدیک ہے جب آپ کے سامنے سید احمد صاحب کی برس ہا برس کی محنت کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

"لا غالب الا اللہ"، کا یہ طغریٰ کوفی خط میں ہے۔ سلطان قابوس والیٔ عمان ومسقط کی مسجد الخور کی چھت اسی سے مزین کی گئی ہے۔ ۴×۴ فٹ کے سائز کے طغرے کا یہ ڈیزائن سید احمد صاحب رام پوری نے تیار کیا تھا۔
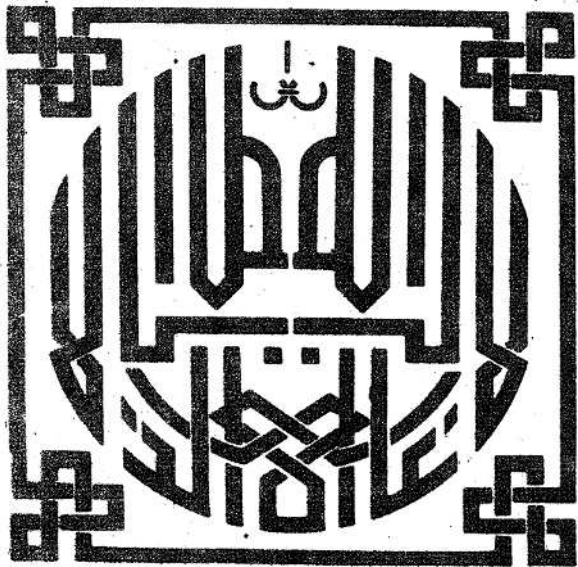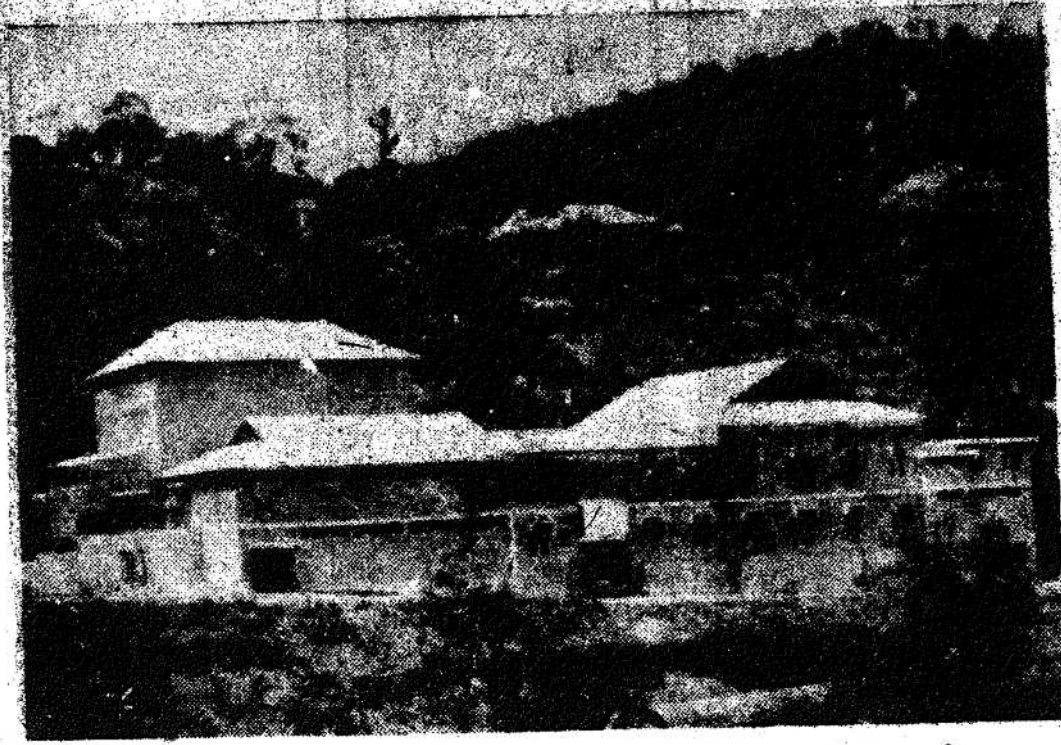
نئے امکانات آپ کا انتظار کر رہے ہیں

موجودہ وسائل سے آپ زیادہ نفع حاصل کر سکتے ہیں

کچھ لوگوں کے ساتھ ایک بار بستی (اتر پردیش) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہارٹی کلچر کے تحت حکومت کا بہت بڑا باغ ہے جس میں ہر قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب نے ہماری تواضع کے لئے چند گلاس رس منگوائے۔ ہم نے پیا تو وہ بہت لذیذ تھا۔ ڈائرکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ تازہ امرود کا رس ہے جو ابھی ابھی درخت سے توڑ کر نکالا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اتر پردیش میں کثرت سے باغات ہیں مگر باغات کے مالک ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ وہ باغ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ کھیتوں میں درخت لگا کر چھوڑ دیا جائے اور فصل کے موقع پر پھل فروخت کر دیئے جائیں حالانکہ جس طرح غلہ کی فصل کی دیکھ بھال اور آب پاشی کی جاتی ہے اسی طرح باغوں کی بھی ہونی چاہئے۔ اس طرح آپ بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

پھر انھوں نے بتایا کہ ملک کے اندر اور باہر پھلوں کے رس کی بہت مانگ ہے، اگر کارخانے قائم کر کے پھلوں سے رس نکالے جائیں اور ان کو معیاری انداز سے پیک کر کے بازار میں لایا جائے تو بہت اچھا منافع کمایا جا سکتا ہے۔ مصنوعی مشروبات جو آج کل بازار میں چل رہے ہیں ان سب سے زیادہ اس کو مقبولیت حاصل ہوگی اور پھر اس طرح آپ قوم کی صحت کا معیار بہتر بنانے میں بھی مددگار بن سکتے ہیں۔

یہ پندرہ سال پہلے کی بات تھی، اب پھلوں کا رس نکالنے کے متعدد کارخانے ملک میں قائم ہو چکے ہیں

شملہ۔ کالکا شاہراہ پر ایک مقام ہے جابلی۔ یہاں پھلوں کے رس کی ایک فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ یہ فیکٹری جدید ترین طرز کی ہے۔ یہاں ہر سال سیب کے رس کے دو ملین بوتل تیار ہوا کریں گے۔ ۲۵ راگست ۱۹۷۶ کو ہماچل پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر پرمار نے اس کا افتتاح کیا۔ یہ فیکٹری کوآپریٹو سیکٹر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی لاگت ۵۰ لاکھ ۴۰ ہزار ہے۔ یہاں پھلوں کے جو رس تیار ہوں گے وہ زیادہ تر برآمد کئے جائیں گے۔ خلیج کے ملکوں میں ان کی بہت مانگ ہے۔

جس کو آپریٹیو سوسائٹی نے اس کو بنایا ہے، اس میں ۳۵۴
باغات کے مالک اور دو چھوٹی چھوٹی کوآپریٹو سوسائٹیاں شامل
ہیں۔ اس فیکٹری میں حکومت نے ۸۹۴۰۰۰ روپے دیئے ہیں
اور بقیہ سرمایہ نجی اداروں سے حاصل کیا گیا ہے۔ فیکٹری
روزانہ پانچ ٹن رس تیار کر سکتی ہے۔ اس میں زیادہ تر
سیب کا رس تیار ہوگا۔ اس کے علاوہ دوسرے پھلوں
کا رس بھی نکالا جائے گا۔ اس میں جام، جیلی، چٹنی وغیرہ
بھی تیار ہوں گی۔ اور تازہ پھل صحت بخش طریقوں کے مطابق
ڈبوں میں پیک کئے جائیں گے۔ فی الحال فیکٹری میں کام
کرنے والوں کی تعداد ایک سو ہوگی۔

فیکٹری کی بلڈنگ ۸۱ لاکھ روپے میں تیار ہوئی ہے
چار لاکھ روپے پانی، بجلی اور سڑک کی مد میں خرچ ہوں گے
یہ منصوبہ مکمل طور پر ملکی ماہرین نے تیار کیا ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱
میں جب ابتداءً اس کا منصوبہ بنایا گیا تو اندازہ تھا کہ
وہ ۲۶ لاکھ روپے میں بن جائے گی۔ اس فیکٹری کے ساتھ
ایک کولڈ اسٹوریج بھی بنایا گیا ہے، تاکہ فصل کے زمانہ میں
اس کے اندر پھل محفوظ کر لئے جائیں اور موسم کے بعد فیکٹری
کے کام آسکیں۔ اس میں بیک وقت ۵۰۰ ٹن پھل رکھے
جا سکتے ہیں۔

نئے طریقوں سے کام کرنے کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے؟
اس کا جواب کوآپریٹو ہے۔ ایک ہزار آدمیوں کے پاس ایک
ایک ہزار روپے ہوں تو وہ محض اپنے سرمایہ سے کوئی بڑا
کام نہیں کر سکتے۔ مگر یہی لوگ اپنا اپنا سرمایہ ایک مشترک
کمپنی میں لگا دیں تو ان کا سرمایہ دس لاکھ روپے ہو جاتا
ہے اور پھر وہ کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں
تمام بڑے بڑے کاروبار مشترک سرمایہ ہی سے چل رہے ہیں۔
مل جل کر کام کرنا ہمیشہ بابرکت ہوتا ہے، خواہ دین کے
معاملہ میں ہو یا دنیا کے معاملہ میں۔

الرسالہ اکتوبر ۱۹۷۷

طرابلس کی ایک تقریر

طرابلس کے دو ماہہ قیام (فروری مارچ ۱۹۷۶ء) میں وہاں
کے تعلیم یافتہ طبقہ کو تقریباً ایک درجن مواقع پر خطاب کرنے کا
موقع ملا۔ یہاں ایک تقریر کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ یہ ۲۶ مارچ
کو کی گئی تھی اور خود ہمارے لئے بھی سبق آموز ہے۔

طرابلس کے متحف (میوزیم) میں ایک بکری رکھی ہوئی ہے
جس کی گردن کے اوپر دو سر ہیں۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں
نے کہا، اگر ایک شخص اس کو دیکھ کر آئے اور آپ اس سے پوچھیں
کہ سب سے عجیب چیز متحف میں تم نے کیا دیکھی۔ تو شاید وہ جواب
دے گا کہ "دو سروں والی بکری"۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ
میں نے سب سے عجیب چیز جو دنیا میں دیکھی وہ دو سروں والے
انسان ہیں۔ طرابلس کے متحف میں تو صرف ایک ایسی بکری ہے جس
کے دو سر ہیں۔ مگر میں نے اپنی ساری عمر میں جتنے انسان دیکھے
سب دو سر رکھنے والے انسان تھے۔

آپ شاید تعجب کریں۔ ممکن ہے آپ میں سے کوئی کہے کہ
اس شخص کو تقریر کی مجلس میں کھڑا کرنے کے بجائے آنکھ کے
اسپتال میں بھیجنا چاہئے۔ آپ جو بھی سمجھیں، مگر یہ ایک واقعہ
ہے کہ مجھے کوئی ایک سر کا انسان دکھائی نہیں دیتا۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو مثال سے سمجھئے۔
آپ کا ایک لڑکا ہے۔ آپ اس کو کامیاب ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں
آپ کیا کریں گے۔ آپ اس کو اسکول میں داخل کریں گے۔ بیالوجی
کے ساتھ ہائی اسکول کرائیں گے۔ پھر بی، ایس، سی کرائیں گے۔
پھر اس کو ایم بی بی ایس کے کورس میں داخل کریں گے۔ پھر آپ
کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کو ایف آر سی ایس کرنے کے لئے لندن
بھیجیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہی آپ یہ امید
کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دنیا میں اپنی جگہ

جو بات ایک شخص اپنی ذات کے بارے میں جانتا ہے وہی بات قوم کے بارے میں بھول جاتا ہے

بنائے۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ وہ اپنے لڑکے کو یوں ہی چھوڑ دے کہ وہ کھیلتا کودتا رہے۔ اس کے بعد جب وہ ۲۵ برس کا ہو جائے تو اس کا باپ اس کو ڈاکٹر بنانے کے حق میں پر جوش تقریریں شروع کر دے، وہ حکومت کو تار بھیجے کہ میرے لڑکے کو اسپتال میں سرجن مقرر کر دو۔ یا یہ کہ اس کو "پس ماندہ" قرار دے کر ڈگری کے بغیر ڈاکٹر تسلیم کر لو۔ آپ میں سے ہر شخص خوب جانتا ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا لڑکا تعلیمی اور تربیتی کورس کو پورا کرے۔ محض مطالبہ کرنے سے کوئی شخص کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ یہ دنیا استحقاق کی دنیا ہے، مطالبات کی دنیا نہیں۔

مگر یہی بات جو ہر آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں جانتا ہے، قومی معاملہ میں وہ اس سے بے خبر ہے، جہاں کسی شخص کو قوم کا درد اٹھا اور وہ اصلاح کے میدان میں کھڑا ہوا، فوراً ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک اور سر پیدا ہو گیا ہے جو بالکل دوسرے ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ اب وہ "تیاری" کے بجائے "مطالبہ" کو کامیابی کا راز سمجھنے لگتا ہے۔ مفروضہ حریف کے خلاف پُر جوش تقریریں کرنا، تار اور میمورنڈم بھیجنا، مطالبات کے ریزولیوشن پاس کرنا، بین اقوامی اداروں میں اپنا کیس لے جانے کی اسکیمیں بنانا، یہی اس کی تمام سرگرمیوں کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہی شخص جو اپنی اولاد کے بارے میں جانتا تھا کہ کامیابی صرف اس طرح ملتی ہے کہ پہلے اس کے لئے صلاحیت اور استعداد پیدا کی جائے، وہی شخص قوم کی اولاد کے بارے میں اپنی ساری سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح بناتا ہے گویا تقریر اور مطالبات ساری کامیابیوں کا راز ہیں۔ یہ لاحاصل جدوجہد بالآخر جب ناکام ہو جاتی ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا۔ اب وہ اپنی مطالباتی مہم کو جاری رکھنے کے لئے نیا لفظ ڈھونڈ لیتا ہے:

"ہم کو پس ماندہ قرار دے کر استحقاق کے بغیر ہی تمام مناصب پر بٹھا دو"۔ ایسے لوگوں کو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ وہ دو سر رکھنے والے لوگ ہیں۔

اس مزاج کے معاملہ میں کسی مسلم قوم کی کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر علاقہ کے مسلمان اسی دُہری ذہنیت کا شکار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا "دوسرا سر" ایک کے خلاف کام کر رہا ہے، کسی کا دوسرے کے خلاف۔

مزید حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ بولنے والوں کو لوگ رہنما سمجھتے ہیں اور ان کو قائد ملت، مجاہد قوم امام العالم جیسے خطابات سے نوازتے ہیں۔ گویا خواص ہی نہیں خود عوام بھی دو سر رکھنے والے لوگ ہیں۔ ایک ذاتی معاملہ کے لئے۔ دوسرا قومی معاملہ کے لئے۔ کوئی نہیں جو ایک سر سے سوچنا جانتا ہو —— ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ میں نے اپنی عمر میں جتنے انسان دیکھے، سب دو سر والے انسان دیکھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

سبق آموز

حضرت حمید الدین ناگوری شیخ طریقت ہونے کے ساتھ عالم اور محدث بھی تھے۔ ان کے ایک مرید آئے اور طریقت کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا: "ان دنوں میں حدیث کی تعلیم دینے میں بہت زیادہ مشغول ہوں۔ میرے پاس طریقت کی تعلیم کے لئے وقت نہیں"۔

تاریخ کا ایک سبق

قدیم ترکی میں دو شخصیتیں علمی و فکری حیثیت سے انتہائی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک نامق کمال (۱۸۴۰ - ۱۸۸۸) دوسرے ضیاء گوک الپ (۱۸۷۵ - ۱۹۲۴) دونوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دونوں ترکی کے علاوہ عربی اور فرنچ زبانیں جانتے تھے۔ انیسویں صدی کی مسلم دنیا کی دوسری تمام شخصیتوں کی طرح اگرچہ یہ دونوں ہی سیاست سے متاثر تھے۔ اور سیاسی انقلاب کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے۔ تاہم دونوں میں یہ فرق تھا کہ نامق کمال نسبتاً معتدل اور متوازن فکر کے آدمی تھے۔ وہ عملی سیاست سے متاثر ہونے کے باوجود اسلامی اصطلاحوں میں سوچتے تھے اور " ترک اتحاد " کے بجائے " اسلامی اتحاد " کے الفاظ بولتے تھے۔ مزید یہ کہ نامق کمال کو ترکی کی جدید نسل میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ خالدہ ادیب خانم نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> " نامق کمال ترکی جدید کی محبوب ترین شخصیت تھی۔ ترکی کے افکار و سیاسیات کی تاریخ میں ان سے زیادہ کسی دوسری شخصیت کی پرستش نہیں کی گئی "

Halde Edib, Turkey Faces West, P.84

دوسری طرف ضیاء گوک الپ ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے فکری نظام میں اسلام بنیادی عامل کی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے دعوت دی کہ ترکی کی تعمیر نو خالص قومی اور مادی بنیادوں پر کی جائے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کا پرجوش علم بردار تھا۔

ترکی کی بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ترکی میں نامق کمال جیسے لوگوں کے افکار کو غلبہ نہیں ملا۔ بلکہ ضیا گوک الپ جیسے لوگ عملاً وہاں کی سیاست و قیادت پر چھا گئے۔ اس کی کم از کم ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ضیا گوک الپ کے افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمال اتاترک (۱۸۸۱ - ۱۹۲۴) جیسا طاقتور اور مضبوط ارادہ کا آدمی مل گیا تھا۔

وہ اسلام پر کتاب لکھ رہے ہیں

ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی مغل تاریخ پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب ہسٹری آف دی مغلس نے اپنے موضوع پر غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ اردو، فارسی ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آج کل وہ لندن کے قریب اسکس میں مقیم ہیں اور اسلام پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں ۸۶ سال کی عمر کے باوجود وہ چار سال سے ہر روز کم از کم سات مکمل گھنٹے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں

تاکہ اس عظیم مذہب کے بارے میں اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کر سکیں۔

ڈاکٹر ترپاٹھی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی جہاں ان کے والد سرکاری ملازمت میں تھے، بنارس یونیورسٹی سے انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ مل گئی۔ اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک انگریز افسر نے اتفاقاً ان کا لکچر سنا۔ اس لکچر سے وہ متاثر ہوا اور اس نے اس کا اعتراف اس طرح کیا کہ لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں ان کو اسکالرشپ دلوادی۔ یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے مگر جب وہ لندن پہنچے تو اسکول کے پرنسپل نے کہا کہ میں آپ کو براہ راست ریسرچ میں داخلہ نہیں دے سکتا۔ پہلے آپ کو ہمارے یہاں سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر ترپاٹھی کو پرنسپل کی بات پسند نہیں آئی۔ وہ مشہور پروفیسر لاسکی سے ملے اور ان کو ساری بات بتائی۔ پروفیسر لاسکی نے کہا کہ آپ کسی بھی اپنے پسندیدہ موضوع پر ایک مضمون لکھ کر مجھ کو دکھائیے۔ انھوں نے مغل ایڈمنسٹریشن پر دس صفحات کا ایک مضمون لکھ کر پیش کیا۔ پروفیسر لاسکی کو وہ مضمون پسند آگیا۔ انھوں نے ان کے اسی مضمون پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیدی۔ اور پھر لندن اسکول آف اکنامکس میں ان کو ریڈر کی جگہ دلوادی جو اس زمانہ میں کسی ہندوستانی کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ ۲۰ سال تک اس اسکول میں ریڈر اور پھر پروفیسر رہے۔

Dr. R.P. Tripathi
Hornchurch
Essex, England

ڈیڑھ سو برس پہلے

سرسید کی کتاب آثار الصنادید پہلی بار ۱۸۴۷ء میں چھپی تھی۔ اس میں انھوں نے دہلی کی جامع مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

دروازہ شمالی اس مسجد کا پائے والوں کے بازار کی طرف واقع ہے۔ اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھتے ہیں اور سودے والے دکانیں لگاتے ہیں۔ لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے تیسرے پہر ایک قصہ خواں مونڈھا بچھائے ہوئے بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ کہتا ہے۔ کسی طرف قصہ حاتم طائی اور کہیں داستان بوستان خیال ہوتی ہے۔ اور صدہا آدمی اس کے سننے کو جمع ہوتے ہیں۔ ایک طرف مداری تماشا کرتا ہے اور بھان متی کا کھیل ہوتا ہے۔ اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے۔" صفحہ ۲۷۸

یہ انیسویں صدی کے وسط میں دہلی کے مسلم عوام کا حال تھا۔ خواص کا حال وہی تھا جو بشار بن برد (م ۱۶۷ھ) نے بنوامیہ کے بارے میں کہا تھا۔

ضاعت خلافتکم یا قوم فالتمسوا خلیفة اللہ بین الزق والعود

اے قوم تمھاری خلافت ضائع ہوگئی۔ اب حال یہ ہے کہ اگر تم اپنے خلیفہ کو تلاش کرنا چاہو تو اس کو شراب و ستارہ کی محفل میں پاؤگے

ایک سفر

۱۹ر جنوری ۱۹۷۶ کو نئی دہلی کے لیبی سفارت خانہ کے پریس ایڈوائزر نے مجھے بتایا کہ حکومت لیبیا نے آپ کو ندوۃ الحوار الاسلامی المسیحی (۱۔ ۵ر فروری ۱۹۷۶ء) میں شرکت کے لئے مدعو کیا ہے۔ ۲۲ر جنوری کو لیبی سفیر ڈاکٹر رجب الزروق سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی ویزا اور ضروری کاغذات دے دیئے۔ دیگر رسمی کارروائیوں سے گزرنے کے بعد ۳۰ر جنوری کو ایر انڈیا کے بوئنگ ۷۴۷ سے روانگی ہوئی کویت اور روم ہوتے ہوئے یکم فروری کو ہم طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اترے۔

اس قسم کا سفر میرے لئے ہمیشہ وحشت کا باعث ہوتا ہے۔ ہم دہلی کے ہوائی اڈہ کی عمارت میں داخل ہوئے اور "صنعتی پنجروں" کی زندگی شروع ہوگئی۔ ہوائی اڈہ سے ہوائی جہاز میں، ہوائی جہاز سے کار میں، کار سے ہوٹل میں، ہوٹل سے آڈیٹوریم میں۔ غرض صنعتی تمدن کے پیدا کردہ خوبصورت پنجروں کا ایک غیر مختتم سلسلہ تھا اور ہم ایک سے دوسرے میں منتقل ہو رہے تھے۔ مشینوں کے معجزے، سائنسی کاریگری کے جلوے اور ٹکنکل ترقیوں کے کمالات کے درمیان خود انسان ایک غیر اہم وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر ترقی یہی ہے تو یہ ترقی انسان کو انتہائی مہنگی قیمت پر ملی ہے۔ کھلی دھوپ، تازہ ہوا اور قدرت کی فضا سے محروم ہو کر ہم ایک مصنوعی زندگی میں بند ہوگئے ہیں۔ یہ زندگی بظاہر کتنی ہی حسین اور چمک دار نظر آتی ہو وہ ہماری فطرت کے مطابق نہیں۔ انسان جب قدرتی ماحول میں ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ سے بھی قریب ہوتا ہے اور خدا سے بھی۔ جب کہ صنعتی تمدن کے ماحول میں وہ دونوں چیزوں سے دور ہو جاتا ہے۔

مختلف مذاہب کے مشترکہ اجتماعات میں اسلام کی نمائندگی کرنے کا موقع مجھے کئی بار ملا ہے:

۱۔ آل مذاہب کانفرنس، سیوہارہ (بجنور)	نومبر ۱۹۵۹
۲۔ وشو دھرم سمیلن، الہ آباد	مئی ۱۹۶۰
۳۔ ورلڈ فیلوشپ آف ریلیجنز، نئی دہلی	فروری ۱۹۶۵
۴۔ مذہب، اخلاق، قانون پر انٹرنیشنل سمینار، نئی دہلی	دسمبر ۱۹۷۳
۵۔ ندوۃ الحوار الاسلامی المسیحی، طرابلس	فروری ۱۹۷۶

طرابلس کے سمینار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس موقع پر دنیا کے دو سب سے بڑے مذاہب اس لئے جمع ہوئے کہ وہ باہم اتفاق کی بنیادیں تلاش کریں اور ایک مسیحی کے الفاظ میں "ماضی کو غرفۃ المحفوظات میں ڈال دیں"۔ اگرچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس قسم کی کسی کوشش سے فائدہ وہی گروہ اٹھا سکتا ہے جو اس سے پہلے اپنی کوئی مثبت جدوجہد منظم کر چکا ہو اور اس کو باقاعدہ چلا رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ویٹکن نے اس موقع پر حکومت لیبیا سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ وہ بن غازی میں اپنا ایک چرچ قائم کرے۔ جب کہ مسلمان اس سمینار سے اس قسم کا کوئی ٹھوس فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

سمینار کا خاص مقصد دونوں مذاہب کے درمیان متفقہ بنیاد تلاش کرنا تھا۔ سب سے زیادہ طویل گفتگو جس مسئلہ پر ہوئی وہ یہ کہ مذہب کا تصور کیا ہے۔ مسلم جانب کا زور اس پر تھا کہ مذہب ایک مکمل قانون ہے۔ زندگی کے تمام معاملات اس کے دائرہ میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس مسیحی جانب کا کہنا تھا کہ مذہب ایک روحانی چیز ہے، وہ بطور ایک قوت محرکہ کے انسان کی سرگرمیوں میں شامل رہتا ہے۔ مگر قوانین وضوابط کی شکل میں وہ اپنا کوئی مخصوص ڈھانچہ نہیں رکھتا۔ کچھ لوگوں نے یہ بحث چھیڑ کر مجلس میں کافی گرمی پیدا کی کہ عیسائی حضرات فلسطین اور اس قسم کے دوسرے معاملات میں کھل کر مسلمانوں کی حمایت کیوں نہیں کرتے۔

میں نے اپنی تقریر میں اس پر زور دیا کہ "اس قسم کے

تمام مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل سوال اسلام کے مذہبی استناد کو تسلیم کرنے کا ہے جس کا عیسائی حضرات اب تک انکار کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ ایسے عیسائی کثیر تعداد میں موجود ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کا یہ ماننا انفرادی طور پر ہے۔ کلیسا نے ابھی تک اس کو نہیں مانا ہے۔ لیبیا کے ایک پادری نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ میں حضرت محمد کو سچا رسول مانتا ہوں۔ مگر ویٹکن کے نمائندہ نے یہ کہہ کر اس کی تردید کردی کہ یہ ان کی انفرادی رائے ہے۔ تاہم اس نے کہا کہ ویٹکن نے ایک کمیٹی خاص اس مقصد کے لئے مقرر کی ہے جو اس بات کا جائزہ لے رہی ہے کہ کیا ہم حضرت محمد کی نبوت کو بطور واقعہ تسلیم کر سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ بنیادی نکتہ جہاں سے مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ "فارقلیط" کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ یوحنا کی انجیل صاف طور پر بتاتی ہے کہ حضرت مسیح نے اس دنیا سے جاتے ہوئے اپنے شاگردوں سے کہا کہ میرے بعد خدا ایک تسلی دہندہ (یا ستودہ صفات) بھیجے گا جو ابد تک تمھارے ساتھ رہے گا۔ وہ کل سچائی کو ظاہر کرے گا، وہ دنیا کا سردار ہوگا، وہ ان باتوں کو بھی بتائے گا جو میں نے نہیں بتائیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری پیشین گوئیاں حضرت مسیح کے بعد کی شخصیتوں میں جس کے اوپر صادق آتی ہیں، وہ صریح طور پر پیغمبر اسلام کی ذات ہے۔ مگر مسیحیوں نے "تسلی دہندہ" کو روح القدس قرار دے کر سارے مفہوم کو الٹ دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تسلی دہندہ روح القدس کی شکل میں حضرت مسیح پر ایمان والے کے اوپر آتا ہے اور ان کے ذریعہ ان سچائیوں کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت مسیح نے نہیں بتائیں۔ اس تعبیر کے ذریعہ انھوں نے ان تمام اضافوں کو حق بجانب قرار دینے کا جواز ڈھونڈھ لیا جو حضرت مسیح کے بعد ان کے ماننے والوں نے حضرت مسیح کے مذہب میں کیں۔ اس نے کلیسا کو حضرت مسیح کا دائمی اور مستند نمائندہ بنا دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو اس آخری اور ابدی سچائی سے محروم کر لیا جو پیغمبر اسلام کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ "فارقلیط" کی صحیح تعبیر کی جائے تو اس سے نبوت محمدی کا اثبات ہوتا ہے اور اس کی غلط تعبیر کی جائے تو اس سے کلیسا کا مذہب برآمد ہو جاتا ہے

تاہم مسیحی جانب نے اس نقطہ نظر سے بچنے کی کوشش کی اس کی کوشش یہ رہی کہ اس اختلافی بحث کو نظر انداز کر کے اتفاق کی مشترک بنیادیں تلاش کی جائیں۔

مسیحی جانب کے بعض ذہین لوگوں نے یہ کوشش کی کہ مسیحیت کے جو عقائد اسلام کی نظر میں قابل اختلاف ہیں، ان کی ایسی خوبصورت تاویل کی جائے کہ وہ قابل قبول نظر آنے لگیں، مثلاً مسیح کے ابن اللہ ہونے کا معاملہ۔ ایک مسیحی نمائندہ ڈاکٹر شوبیکل نے کہا کہ مسیح کے ابن اللہ ہونے کا مطلب دراصل بشریت کے اعلیٰ معیار کو ممثل کرنا ہے۔ انسان ایک بشر کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اپنے اعلیٰ کردار کے ذریعہ اس کو خدا جیسا بننا ہے۔ مسیح کا خدا کا بیٹا ہونا اعلیٰ ترین انسانی بلندی کی تمثیل ہے۔ مگر یہاں فوراً یہ سوال تھا کہ مسیح کا ابن اللہ ہونا اگر تمثیلی معنوں میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان خدا کا بیٹا بن سکتا ہے۔ اس تعبیر کے بعد کفارہ کے عقیدہ کے لئے کوئی بنیاد نہیں رہتی جس پر موجودہ مسیحیت کی ساری عمارت قائم ہے ایک ملاقات میں میں نے ڈاکٹر شوبیکل کے سامنے یہ سوال رکھا تو انھوں نے کہا کہ یہ نقطہ نظر بلاشبہ ویٹکن کے سرکاری عقیدہ کے خلاف ہے۔ مگر ہمارے یہاں فکری آزادی ہے۔

وہ واحد مسئلہ جس پر دونوں فریقوں کا سب سے زیادہ اتفاق ہو سکا وہ "انحراف الشباب فی جانبین" کا مسئلہ تھا۔ یہ مسلم اور عیسائی دونوں معاشروں کا مشترک مسئلہ

ہے کہ نوجوان طبقہ مذہبی روایات سے کٹ کر الحاد کی طرف
چلا جا رہا ہے۔ متفقہ طور پر یہ رائے سامنے آئی کہ اس مسئلہ
کے مقابلہ کے لئے دونوں کو مل کر کام کرنا چاہئے۔ مگر اس
معاملہ میں کوئی ٹھوس پروگرام وضع نہ کیا جا سکا۔ ایک صاحب نے
"بدء الحوار مع الملحدین" کی تجویز پیش کی۔ یعنی جس طرح
مسلمان اور عیسائی یہاں بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہیں، اسی
طرح ملحدین سے بھی گفتگو کا آغاز کیا جائے۔ مگر یہ کوئی تجویز
نہیں۔ اس قسم کی باتیں صرف یہ ثابت کرتی ہیں کہ مسئلہ کے
احساس کے باوجود اس معاملہ میں ابھی تک زیادہ گہرائی سے
سوچا نہیں جا سکا ہے۔

راقم الحروف کا تجربہ ہے کہ ۹۹ فی صد لوگ وقت
اور موضوع کے حدود میں رہ کر بولنا نہیں جانتے۔ طرابلس کا
سمینار بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بیشتر تقریریں اور مقالے غیر ضروری
طور پر طویل اور موضوع سے ہٹے ہوئے تھے۔ ایک شخص کھڑا
ہو کر یہ کہتا: انی لا احب الاطالۃ علیکم اور جب اس اظہار
کے باوجود اس کی تقریر لمبی ہو جاتی تو آخر میں معذرت کرتا کہ:
ایہا الاخوۃ اشکرکم علیٰ صبرکم۔ ایک شخص اصل موضوع
سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع پر لمبی تقریر کر
ڈالتا اور پھر یہ کہہ کر حاضرین کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا:
فما اظن انی قد ابتعدت عن الموضوع۔ کوئی شخص
مختصر وقت میں اپنی تقریر ختم کر دیتا تو یہ اتنی نادر چیز ہوتی کہ
صدر جلسہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی ادا کرتا:
اشکر خاصۃ علیٰ تقییدہ بالوقت المحدد

ندوۃ الحوار الاسلامی المسیحی میں ایک جرمن پادری
سے میں نے بائبل کے عربی ترجمہ کی خواہش ظاہر کی۔ اگلے دن
اس نے نہایت عمدہ چھپائی اور نہایت عمدہ جلد کے ساتھ
عربی انجیل کا ایک نسخہ مجھے ہدیۃً پیش کیا۔ میں نے کہا۔ کیا مکمل
بائبل عربی میں مل سکتی ہے۔ اس نے کہا ضرور۔ یہاں تو ہمارے
پاس اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ البتہ آپ اپنا پتہ دے
دیجئے۔ ہم جرمنی سے بھجوا دیں گے

مسیحی مبشرین اپنی مقدس کتاب ہر زبان میں سارے
عالم میں پھیلا رہے ہیں۔ کاش اسی طرح ہم قرآن کو ہر زبان میں
ساری دنیا میں پھیلا سکیں۔

فروری کی ۳ تاریخ تھی اور شام ۶ بجے کا وقت۔
طرابلس کے مسرح التحریر میں ۶۰ سے زیادہ ملکوں کے تقریباً پانچ
سو مسلمان اور عیسائی جمع تھے۔ اچانک کارروائی رک گئی۔
لوگ گیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ فوٹو گرافر بھاری بھاری
کیمرے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے مسلسل شاٹ لینے لگے۔
معلوم ہوا کہ لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی آئے ہیں۔ وہ
بالکل اچانک آئے تھے۔ لوگوں نے کوشش کی کہ ان کو
ڈائس پر لے جائیں۔ مگر وہ عام لوگوں کے ساتھ ایک خالی
سیٹ پر بیٹھ گئے اور نہایت خاموشی کے ساتھ کارروائی
سننے لگے۔

دبلا پتلا سا ایک آدمی، کھلا سر، کالے رنگ کا
معمولی کوٹ پتلون جس پر ٹائی بندھی ہوئی نہیں تھی۔ ہر قسم
کے نشان سے خالی ایک معمولی آدمی کی طرح اپنی کرسی پر
خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

کارروائی بدستور جاری رہی۔ درمیانی وقفہ کے بعد
دوسری نشست میں لوگوں نے صدر قذافی سے اصرار کیا تو
وہ ڈائس پر گئے۔ وہاں بھی کسی امتیازی نشست پر نہیں بیٹھے
بلکہ ایک عام کرسی پر بیٹھ گئے۔ درمیان میں تین بار انھوں
نے لوگوں کی فرمائش پر تقریر کی۔ تینوں تقریریں سادہ الفاظ
کے ساتھ، کسی تمہید کے بغیر شروع ہوئیں اور بالکل اچانک ختم
ہو گئیں۔ مسیحی جانب نے مذہب کا روحانی تصور پیش کیا تھا
اور کہا تھا کہ مذہب کو حکومت وغیرہ کے معاملات میں داخل
نہیں کرنا چاہئے۔ مذہب کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ قوت
محرکہ (MOTIVE FORCE) کے طور پر تمام سرگرمیوں میں
کام کرے۔ صدر قذافی نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنی
تقریر میں کہا کہ ویٹکن میں تو عیسائیوں کی حکومت قائم ہے۔
وہ کیسے ہے۔

لقاء مع «وحيد الدين خان» مؤلف «الاسلام يتحدى»

محمد سليمان
القاهرة

متى نستوعب تقاليد العصر من أجل الدعوة للإسلام؟

وحيد الدين خان مفكر اسلامى .. مؤسس مدرسة اسلامية جديدة فى الفكر الاسلامى المعاصر .. وهو رئيس تحرير « الجمعية الاسبوعية » اكبر المجلات الاسلامية فى الهند واوسعها انتشارا ، ومؤلف « الاسلام يتحدى » الذى يعد نهجا مستقلا فى تقديم الاسلام باسلوب العصر وعلى ضوء العلم ونتائجه الباهرة ، وهو مؤسس مدرسة اسلامية جديدة قوامها الدعوة الى الدين الاسلامى كما هو دون الخروج به الى ماتعكسه الظروف النفسية للمسلمين فى العصر الحديث . وقوامها ايضا فهم العصر كما هو دون الخروج به الى ماتعكسه نفسيات المسلمين نتيجة للانبهار من جهة ونتيجة للجهل ايضا .

فهى – اى هذه المدرسة – تؤمن بوجوب مواجهة التحديات التى يواجهها المسلمون بنفس المصطلحات والوسائل التى يستخدمها الاعداء .. ونبذ الاتجاه الى تحويل الاسلام من دعوة الى حزب سياسى ، او من فكر روحى الى فكر سياسى او فكر ايديولوجى مركزا على النواحى العلمية فى العصر باعتبارها المدخل الجديد لتقبل الاسلام ، باعتباره الحقائق الوحيدة فى هذا العالم فى مجال العقيدة .

والمفكر الهندى هو الاخر صاحب مشروع المركز الاسلامى وقد عرض هذا المشروع فى كتيب صغير بعد ان قام بدراسة عميقة لظاهرتين فى التاريخ الحديث .. وهما اليابان واليهود فى الولايات المتحدة الامريكية .

ولقد جاءت قرارات مؤتمر الدعوة الاسلامية الذى انعقد فى طرابلس الغرب فى ديسمبر عام ١٩٧٠ مماثلة بصورة مدهشة لهذا البرنامج ، وكذلك يوجد توافق كبير بين هذه المقترحات وبين قرارات المؤتمر الاسلامى الذى عقده المركز العام لجمعيات الشبان المسلمين فى ابريل عام ١٩٧١ م .

ولقد كان لقاؤنا بهذا المفكر الهندى المسلم ابان انعقاد الحوار الاسلامى المسيحى فى طرابلس ، والذى حضره بصفته مراقبا . ونحن مع تقديرنا له لفتح قلبه لنا .. نتمنى ان يفتح القراء قلوبهم له فهو صاحب رغبة فى ان يفهم فهما سليما بعيدا عن التصورات المسبقة التى تعوق ادراك الانسان عن الحكم الصحيح .

● هناك عدة مسائل نرغب فى طرحها أوجزها تاملنا فى مؤلفاتكم وبالذات « حكمة الدين » – اى اننا نريد ان نعرف على ماذا تبنون رأيكم فى المركز الاسلامى .. كمشروع هام يجب ان يقوم به المسلمون وفق تصوركم الشامل الذى عرضتموه فى منشور خاص .

لیبیا کے دوران قیام میں وہاں کے اخبارات کے نمائندوں نے صاحب مضمون سے ملاقاتیں کیں اور اس کی رپورٹیں شائع کیں۔ روزنامہ الفجر الجدید (طرابلس) کے ہفتہ وار اڈیشن الاسبوع الثقافی (۲۶ مارچ ۱۹۷۶) میں جو تفصیلی انٹرویو شائع ہوا تھا اس کے ابتدائی حصہ کا چربہ مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔ روزنامہ الجہاد (۵ فروری ۱۹۷۶) کے صفحہ ملاقات کا پہلا پیراگراف یہ تھا

الجهاد الخميس ٥ من صفر ١٣٩٦ هـ

لقاءات سريعة

* من مفكرى الاسلام المشاركين فى اعمال الحوار المفكر الاسلامي وحيد الدين خان رئيس تحرير مجلة (الجمعية الاسبوعية) التي تصدر في دلهي بالهند وصاحب الكتاب الشهير (الاسلام يتحدى) .

حول دراساته الاسلامية الجديدة قال (للجهاد) انه قد انتهى من اعداد دراسة شاملة تصدر في كتاب يحمل عنوان (الأسلام) يبرز فيه الحقائق الاساسية للاسلام ... الباكستان كتاب (الله واحد وانسان واحد ونظام واحد)

سیمنار کے بعد طرابلس میں دو ماہ قیام رہا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت سے اجتماعات میں خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس کا ذکر علیحدہ تفصیل چاہتا ہے ——

۸ فروری کو معمر قذافی (صدر جمہوریہ لیبیا) سے بھی ملاقات ہوئی فوراً ہی انھوں نے کہا "میں آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھ چکا ہوں"۔ عربی میں یہ کتاب اب تک دس سے زیادہ بار چھپ چکی ہے اور پورے عالم عرب میں پھیلی ہے۔ انھوں نے کتاب کو ایک عظیم کتاب بتایا۔ ملاقات کے دوران صدر قذافی نے اپنے ایک ساتھی سے راقم الحروف کا تعارف کراتے ہوئے کہا: هو مفكر و مؤلف كبير و نحن نقدره كثيرا

الجہاد (طرابلس) ۸ فروری ۱۹۷۶

صدر قذافی انتہائی سادہ آدمی ہیں۔ بظاہر ان کو دیکھ کر کسی قسم کی عظمت کا تصور نہیں ہوتا "یہی وہ آدمی ہے جو لیبیا کا حکمراں ہے جس کے ہاتھ میں پٹرو ڈالر کے خزانے ہیں"، میں نے سوچا "اس معمولی سے آدمی میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے اس کو اس مقام تک پہنچایا" اور پھر میرے دل نے جواب دیا "خطرہ (RISK) مول لینے کی صلاحیت"۔

یکم ستمبر ۱۹۶۹ کو جب قاریونس کے معسکر (بیرک) سے اس معمولی افسر اور اس کے ساتھیوں نے بن غازی کی طرف مارچ کیا تو ہر لمحہ ان کے لئے موت کا لمحہ تھا۔ سابق شاہ ادریس اگرچہ اس وقت ترکی میں تھے مگر ان کی سیکورٹی فورس جو ہوائی جہازوں تک سے مسلح تھی، کوئی بھی کارروائی کرنے کی مکمل قدرت رکھتی تھی مگر انھوں نے جان پر کھیل کر ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور اچانک اعلان کر دیا:

قامت قواتك المسلحة — آپ کی مسلح فوجوں نے

بالاطاحة بالنظام — رجعت پسند متخلف اور بدعنوان

الرجعي المتخلف المتعفن — حکومت پر قبضہ کر لیا ہے

وهكذا من الآن تعتبر — آج سے لیبیا آزاد اور

ليبيا جمهورية حرة — با اختیار ہوگا اور اس کا

ذات سيادة تحت اسم — نام ہوگا "جمہوریہ عربیہ

الجمهورية العربية — لیبیا"

الليبية (رئیسی ابنی)

اس سیمنار کا سب سے زیادہ مؤثر حصہ اس کا خاتمہ تھا۔ دونوں طرف کے نمائندوں نے نہایت مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا۔ مسلم نمائندہ نے کہا: اذا مشيتم الينا ميلا مشينا اليكم ميلين، واذا اتيتم الينا مصافحين هرولنا اليكم معانقين۔ مسلم نمائندہ نے رواداری کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا: نحن بما عندنا وانتم بما عندكم ولكل راي۔ مسیحی نمائندوں کا رویہ بھی نہایت دوستانہ تھا۔ ایک مسلم نمائندہ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ وہ فلاں مسیحی نمائندہ سے ملا تو گفتگو کے دوران اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بعد مسلم نمائندہ نے یہ آیت پڑھی: وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّة

کانفرنسوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جنھوں نے کانفرنس ہال کے باہر اپنی عملی بنیاد تیار کر رکھی ہو

لِلَّذِيْنَ آمَنُوا ... (مائدہ ۸۳-۸۲) تاہم یہ منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ تقریروں کے ساتھ تالیوں کی دھوم تھی۔ مگر جب ایک مسلم نمائندہ نے کہا "ہم گواہی دیتے ہیں کہ عیسیٰ کلمۃ اللہ تمام انسانوں کی طرف خدا کے پیغمبر تھے۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف خدا کے پیغمبر ہیں"، تو مسلمانوں نے دیر تک تالی بجائی مگر مسیحی نشستوں پر خاموشی طاری رہی۔

۶ فروری کی شام کو سیمینار کا خاتمہ انجیل اور قرآن کی تلاوت پر ہوا۔ دونوں تلاوتیں ایک عیسائی عالم نے کیں۔ پہلے اس نے انجیل (متی باب ۲۵) عربی میں پڑھی۔ پڑھنے والا پادری نہایت خوش الحان تھا اور خالص عربی لہجہ میں پڑھ رہا تھا اس کے بعد اسی پادری نے قرآن (البقرہ، آخری آیات اور سورہ علق کی کچھ آیات) پڑھیں۔ دونوں تلاوتیں اس نے تجوید اور قرأت کے تمام قواعد کے ساتھ کیں۔ قرآن کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ شروع کیا اور آخر میں صدق اللہ العظیم کہا۔

اصل انجیل بلاشبہ ایک خدائی کتاب تھی۔ مگر اس کا موجودہ عربی ترجمہ ظاہر ہے کہ انسان کے قلم سے ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی زبان الہامی زبان ہے۔ جب دونوں کتابوں کے حصے ایک ساتھ پڑھے گئے تو یہ گویا خاموش اعلان تھا کہ یہ انسانی کلام ہے اور وہ خدائی کلام۔ انجیل کی قرأت میں ساری کوشش کے باوجود کوئی شکوہ پیدا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس قرآن حیرت انگیز طور پر ایک عظیم کلام کی مانند ہال کے اندر گونج رہا تھا۔ اس کی مجرد سماعت ہی یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ یہ ایک بلند تر خدائی کلام ہے نہ کہ کوئی انسانی کلام۔

مسلم۔ عیسائی سیمینار کے بارے میں یہ عربی کارٹون طرابلس کے اخبار الجہاد (۸ فروری ۱۹۷۶) سے لیا گیا ہے۔

اُس کا حکم تھا کہ موت کا لفظ اس کے سامنے بولا نہ جائے مگر عمر کے ساٹھویں برس پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا

اسپین کے ڈکٹیٹر فرینکو، کئی دن بیماری سے جنگ کرنے کے بعد آخر کار اس دنیا سے چل بسے اب اس قسم کے دو لیڈر بچے ہیں۔ وہ ہیں یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو اور چین کے ماؤسی تنگ۔ دونوں کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ ہے۔

فرینکو کا عرصۂ حیات لمبا کرنے کی غرض سے سپین میں ڈاکٹروں نے جو رات دن کوشش کی اُس سے میڈیکل حلقوں میں بڑی زبردست بحث چھڑ گئی تھی کہ کیا اُس وقت جبکہ قدرت کے تمام قوانین کے مطابق اُن کے حواس جواب دے چکے تھے۔ اُنھیں کچھ ہفتہ پیشتر ہی مرنے دینا چاہیئے تھا؟ یا کیا ڈاکٹر اس بات میں حق بجانب تھے کہ ہر قسم کی میڈیکل امداد اُنھیں مہیا کر کے کچھ دیر تک اور جسمانی طور پر زندہ رکھنے کے لئے اُن کے درجہ حرارت کو خردبی طور پر منجمد کر دیتے۔ علاوہ بریں کیا یہ بات اخلاقی اصول کے مطابق ہے کہ قوم کے کسی لیڈر کی زندگی مصنوعی طور پر لمبی کرنا چاہیئے یا کہ اُسے لمبا کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ میڈیسن کی دنیا میں ایک زبردست بحث چھڑنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ بہت سے اسکالروں نے اِس موضوع پر بحث کی ہے۔

یہ امر غیر معمولی طور پر اتفاقیہ ہے کہ اِس معاملہ پر ایک کتاب ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کی تصنیف پر ۱۴ سال لگ گئے تھے۔ مشہور مورخ پال مرے کنیڈال نے یہ کتاب فرانس کے ۱۱ ویں بادشاہ لوئی کے بارے میں لکھی ہے جسے مرے ۵۰۰ برس ہو چکے ہیں۔ لوئی ایک ایسا بادشاہ تھا جو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے بہت کوشش کی کہ اُس کی زندگی کو طوالت دی جائے۔

ماؤ، ٹیٹو اور فرینکو کی مانند بادشاہ لوئی ایک ایسی قوم، جس کی مرکزی سرکار بہت مضبوط تھی۔ بنانے کے لئے ذمہ دار تھے۔ اور جو اُن کے آنکھ بند کرنے کے بعد انتشار یا خانہ جنگی کا شکار ہو سکتی تھی اُسے اس بات کا بخوبی علم تھا، جیسا کہ ہمارے جدید زمانہ کے لیڈروں کو علم ہے۔ ایک جیسے مسائل کے لئے اُس کے حل بھی ویسے ہی تھے۔ لوئی کی عمر ۵۸ سال کی تھی جب اُس پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اُسے تب اِس امر کا علم ہو گیا کہ وہ بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکے گا۔ کیونکہ اُس کے پریوار میں کوئی بادشاہ اپنا ۶۰ واں جنم دن منا نہ سکا تھا۔

لوئی کسی محفوظ قلعے میں امن و شانتی سے رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک محل میں رہنا شروع کیا جہاں بہت کم لوگوں کو داخلہ کی اجازت تھی۔ اس محل کی طرف جانے والی سڑکوں پر جنگلے لگا دیئے گئے تھے۔ اور محل کے چاروں طرف خندق کھود دی گئی تھی۔

چالیس تیرانداز پتھروں کی دیواروں پر بیٹھے ڈیوٹی دیتے رہتے تھے۔ انھیں حکم تھا کہ اگر کوئی اجازت کے بغیر محل کے نزدیک آنے کی جرأت کرے تو اُسے قتل کر دیا جائے۔ علاوہ بریں ..۸ گھوڑ سوار دن رات علاقہ میں گشت کرتے رہتے تھے۔ محل کے اندر لوئی بڑی عیش پرستانہ زندگی گذار رہا تھا۔ اُس کے کمرہ میں خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں۔ ماہر راگی اپنا راگ سنا کر اُسے خوش رکھتے۔ بڑے بڑے پنجروں میں بند کتے اور پرندے جو وہاں رکھے ہوئے تھے اُسے بہت پسند تھے۔ زیادہ تر وقت وہ اپنے جسم کو اکٹھا کئے اور قابل رحم حالت میں آرام کرسی پر ہی گذارتا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا۔ جسے وہ اپنے محل کی دوسری منزل سے دیکھتا رہتا۔

اگرچہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہو چکا تھا۔ اپنی قوم کی زندگی اور موت اُس کے اختیار میں تھی۔ اس پر بھی وہ فکرمند تھا کہ اپنی رعایا پر یہ امر کیسے واضح کرے کہ وہ سب سے بڑا حکمران ہے۔ اُس کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ اختیارات کا خواہشمند کوئی امیر، منصب دار اُسے ہٹا کر خود اقتدار نہ سنبھال لے اور اُسے اپنے آخری ایام ایک دیوانہ بوڑھے کی مانند گزارنے نہ پڑیں۔

اپنے بڑھاپے میں لوئی ہر ایک پر شبہ کرنے لگا تھا۔ اُسے اپنے پرانے ملازموں پر بھی شک تھا۔ چنانچہ انہیں ہٹا کر اُن کی جگہ اُس نے غیر ملکی بھرتی کر لئے تھے۔ اور پھر اُن کو اور اُن افسروں کو بھی جو اُس کی حفاظت کے لئے مامور تھے۔ وہ متواتر تبدیل کرتا رہتا تھا۔ وہ اُن سے یہی کہا کرتا کہ "قدرت کو تبدیلی بہت پسند ہے۔" سرکار کے کام کاج میں حصہ لینے کے لئے وہ کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ اُسے یہ فکر دامنگیر تھی کہ شاید رعایا اس بات کو بھی بھول جائے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کے ہمعصر ایک مورخ نے اُس کی نسبت تحریر کیا ہے۔ "اُس نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ابھی تک حکمران ہے ہر قسم کی چال چلی۔ وہ افروں کو ڈسمس کر دیتا اور اُن کی جگہ نئے افسر مقرر کر دیئے جاتے۔ کسی کی وہ تنخواہ کم کر دیتا تو کسی کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا۔ اُس نے اپنا وقت افسروں کو مقرر کرنے اور اُن کا بھٹہ بٹھانے میں صرف کیا تھا۔"

لیکن یہ سب کچھ کافی نہ تھا۔ ااواں لوئی ایک عظیم شکاری تھا۔ جانوروں سے وہ بہت انس کرتا تھا۔ اُس نے گھوڑے اور کتے منگانے کے لئے یورپ بھر میں اپنے نمائندے بھیجے۔ اور مارکیٹ کی قیمت سے بھی زیادہ دے کر انہیں خریدا۔ چنانچہ اٹلی، سویڈن اور جرمنی سے گھوڑے اور کتے آنے شروع ہو گئے۔ جب وہ اُس کے محل میں پہنچ جاتے، اُس کی صحت کمزوری کے سبب اس امر کی اجازت نہ دیتی کہ وہ انھیں دیکھ بھی سکے۔ یا جو لوگ اُن کو خرید کر لائے ہیں اُن سے بات تک بھی کر سکے۔ لیکن اُسے علم تھا کہ سارے یورپ میں اُس کی اس خریداری پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

وہ ابھی تک زندہ تھا۔

اپنی صحت بحال کرنے کا وہ اتنا آرزومند تھا کہ اُس نے اس امر کا حکم دے رکھا تھا کہ موت کا لفظ اُس کے سامنے بولا ہی نہ جائے۔ اُس کا ذاتی معالج اُس کے ایک نوکر کی مانند کام کرتا تھا۔ اور بادشاہ کا وہ پسندیدہ بن گیا تھا۔ اُسے ....،،۱۰ سنہری کراؤن ماہوار دیئے جانے لگے تھے۔ اُس وقت یورپ کے کسی میدانِ جنگ میں ۲۰ برس کام کر کے بھی ایک فوجی افسر اتنی رقم کما نہ سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص اُس کی زندگی میں ایک دن کا بھی اضافہ کر سکے تو وہ اپنا سارا خزانہ لٹانے کو تیار تھا۔ ۲۳ر جولائی ۸۲ء

کو جب اُس کا ۶۰ واں جنم دن نزدیک آنے والا تھا وہ اور بھی فکر مند ہو گیا۔ اُس وقت وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ وہ مشکل سے لقمہ اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال سکتا تھا۔

اُس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اُس نے ہزاروں سنہری سکے جرمنی، روم اور نیپلز کے گرجا گھروں اور مذہبی رہنماؤں میں تقسیم کرنا شروع کر دیتے۔ اُس نے تین بحری جہاز دے کر اپنے بہترین کپتان ایک جزیرہ کو بھیجے۔ تاکہ وہاں سے بڑے بڑے کچھوے لائے جائیں۔ اس کو بتایا گیا تھا کہ یہ بحری کچھوے زندگی بخش خواص کے مالک ہیں۔

اسے یاد تھا کہ فرانس کے بادشاہوں کو ان کی تاجپوشی کے وقت ایک خاص قسم کی کریم کا تلک لگایا جاتا ہے۔ یہ ایک کہاوت ہے کہ یہ کریم ۴۹۶ء میں قدیم زمانہ کے ایک بادشاہ کو ایک فاختہ نے مہیا کی تھی۔ اور وہ اس کی موت سے چند ہی دن پہلے ایک سنہری رتھ میں پہنچی تھی۔ لوئی نے تمام مذہبی ذرائع کو جو ممکن تھے اِس مقصد کے لئے جتایا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ رہ سکے۔ آخر کار نیپلز کی ایک گپھا سے ایک جوگی اس امید کے ساتھ اُس کے محل میں لایا گیا کہ اس کی پرارتھنا سپھل ہو گی۔ لیکن وہ بے اثر ثابت ہوئی۔ تاہم لوئی اُسے اپنے نزدیک رکھنے کا اِتنا خواہش مند تھا کہ اُس نے اپنے وزیر خزانہ کو حکم دے دیا تھا کہ اس جوگی کے لئے سنگترے خریدنے کے لئے خواہ سارا خزانہ کیوں نہ صرف کرنا پڑے ضرور خریدے جائیں۔

لوئی پر پھر فالج کا حملہ ہوا، اور ۳۰ اگست کو وہ اس دنیا سے چل پڑا۔ اُس کے منہ سے آخری لفظ یہی نکلے۔

"میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔"

فرانس کے عوام کو یہ بات بخوبی یاد ہے کہ کس طرح سے اپریل ۱۹۷۴ء میں صدر جارج پومپیڈو نے جب وہ کینسر کی وجہ سے مر رہے تھے اپنے آخری بیان میں کہا تھا۔

"میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔"

اور چند روز بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔

آخر کار ۱۱ ویں لوئی کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔ (ماخوذ)

ایجنسی کی شرائط

۱۔ الرسالہ کی جتنی تعداد ہر ماہ مطلوب ہو، اس کے مطابق پوری رقم بطور ضمانت دفتر الرسالہ میں جمع کرنا۔ (مثلاً ماہانہ دس پرچوں کے لئے ۲۰ روپے)

۲۔ کم از کم دس پرچوں پر ایجنسی دی جائے گی۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فیصد

۴۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے ہر ماہ بذریعہ وی۔ پی روانہ ہوں گے۔

۵۔ ڈاک اور پیکنگ خرچہ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

منیجر

شہاب ثاقب

۱۳ر نومبر ۱۸۳۳ کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقہ میں ایک مقام پر لوگوں نے دیکھا کہ آدھی رات سے لے کر صبح تک مسلسل شہاب ثاقب گر رہے ہیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ تقریباً دو لاکھ کیا گیا ہے برہنہ آنکھوں سے اس قسم کا مشاہدہ اگرچہ بہت کمیاب ہے۔ تاہم دوربین کے ذریعہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑی تعداد میں ہر وقت شہاب ثاقب کی بارش ہماری زمین پر ہوتی رہتی ہے۔ اندازہ ہے کہ روزانہ تقریباً دس کھرب شہاب ثاقب اوپر سے آتے ہیں جن میں سے دو کروڑ کے قریب زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کی رفتار رائفل کی گولی سے سیکڑوں گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یعنی کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ بعض اوقات ۵۰ میل فی سکنڈ تک بھی دیکھی گئی ہے۔

زمین کے گرد ہوا کا کرہ ایک غلاف کی شکل میں تمام دنیا کو گھیرے ہوتے ہے۔ اس کی ابتدائی بلندی تقریباً چھ میل ہے۔ اس غلاف کی وجہ سے شہاب ثاقب ہماری زمین تک پہنچ نہیں پاتے۔ بلکہ کرۂ ہوا کی اوپری سطح تک پہنچتے ہی ہوا کے ساتھ ٹکرا جاتے ہیں اس رگڑ کے سبب سے اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ شہاب ثاقب جل اٹھتے ہیں۔ یہی جلنے کی روشنی ہے جو ہم کو ٹوٹتے ہوئے تارے کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ اس ٹکراؤ سے شہاب ثاقب پاش پاش ہو کر باریک ذرات کی شکل میں ہوا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ہوا کا غلاف دنیا کے گرد نہ ہوتا تو شہاب ثاقب بہت بڑی تعداد میں نہایت شدت کے ساتھ زمین پر گرتے جن کے خلاف ہم کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے تھے۔ اور ساری زمین چھلنی ہو کر رہ جاتی۔ چاند کی سطح پر کثرت سے جو غار پائے جاتے ہیں، خیال ہے کہ یہ اسی قسم کے شہابیوں کی بمباری سے پیدا ہوتے ہیں۔

زمین کی طرف آنے والے شہابیوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زیادہ بڑے ہونے کی وجہ سے جل نہیں پاتے اور زمین پر گر پڑتے ہیں۔ چونکہ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی ہے اور خشکی کا بھی بہت بڑا حصہ جنگل اور بیابان وغیرہ کی شکل میں انسانوں سے خالی ہیں۔ اس لئے یہ اتفاقی شہابیے عملاً یا تو سمندر میں ڈوب جاتے ہیں یا شہروں سے دور کسی جنگل بیابان میں گر پڑتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے مختلف حصوں میں ایسے بہت سے پتھر کے ٹکڑے پائے گئے ہیں جو غار میں پڑے ہوئے تھے اور اس طرح سمجھا گیا ہے کہ یہ اوپر سے آئے تھے۔ ان شہابی پتھروں میں ایک وہ ہے جو امیری زونا میں پایا گیا تھا جس کا وزن ۵۴۶ پونڈ ہے۔ یہ زمین پر گر کر گیارہ فٹ تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ اسی طرح ایک مقام پر ساڑھے ۳۶ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے۔ اس کو بھی اسی قسم کا آسمان سے گرا ہوا مادہ سمجھا جاتا ہے۔

بلاغت کیا ہے

عبداللہ بن المقفع (۱۰۶۔۱۴۲ھ) اپنے زمانہ کا اعلیٰ ترین ادیب تھا۔ فارسی اور عربی دونوں میں اس کو غیر معمولی قدرت تھی۔ اس نے بلاغت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے: "بلاغت یہ ہے کہ جب ایک جاہل اسے سنے تو سمجھے کہ وہ بھی اس طرح کی عمدہ عبارت لکھ سکتا ہے"

سوال و جواب ——

سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کے کلچرل تحفظ کا مسئلہ ہے۔ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے۔

جواب: کلچرل تحفظ کی بات کرنے والے لوگ سخت غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی الگ کلچر ہی نہیں جس کے تحفظ کی ضرورت ہو۔ اگر کسی چیز کے تحفظ کی ضرورت ہو سکتی ہے تو وہ دین و اخلاق ہے نہ کہ کلچر۔

اس قسم کی باتیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ مسلمان کی اصل حیثیت کو بھول گئے ہیں۔ مسلمان کی اصل حیثیت داعی اور پیغامبر کی ہے۔ داعی کے مشن کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مدعو سے کلچرل یگانگت پیدا کرے نہ کہ کلچرل بے گانگی۔ لباس اور زبان اور رہن سہن وغیرہ جن کے مجموعہ کو کلچر کہتے ہیں، ان میں اگر داعی اور مدعو الگ الگ ہوں تو دونوں کے اندر انس اور قربت پیدا نہیں ہو سکتی اور جب تک انس اور قربت نہ ہو، سننے والا نہ سنانے والے کی آواز کو سنے گا اور نہ اس پر دھیان دے گا۔

داعی اور مدعو کے اسی نازک رشتہ کی وجہ سے پیغمبروں کو اسی قوم سے چنا گیا جس کے اندر انھیں دعوتی کام کرنا تھا۔ پیغمبر وہی زبان بولتے تھے جو ان کی مدعو قوم بولتی تھی۔ حتیٰ کہ جب کچھ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم فرشتہ بھیجیں تب بھی اس کو تمہارے جیسا آدمی بنا کر بھیجیں گے اور اس کو وہی لباس پہنائیں گے جو تم پہنتے ہو۔ (انعام - ۹)

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کا "کلچر" بھی وہی تھا جو غیر مسلموں کا تھا۔ ان کے درمیان جو اختلاف ہوا وہ اعتقاد اور عمل کی بنیاد پر تھا نہ کہ جدید اصطلاح کے مطابق محض کلچر کی بنیاد پر۔

ٹریکٹروں کی ایک کھیپ کابل کے لئے ہوائی جہاز پر چڑھائی جا رہی ہے۔ افغانستان سے یہ اس قسم کا دوسرا آرڈر ہے۔
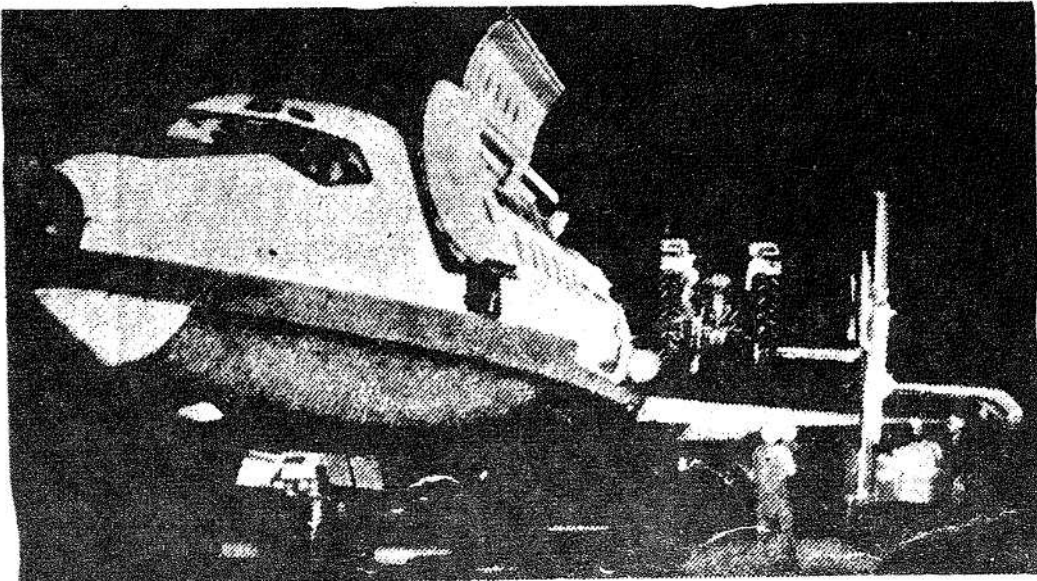
Destination Kabul. An Escort tractor, part of a consignment of 400 tractors, being loaded aboard an Ariana Afghan Airlines plane.

ہندستانی مصنوعات کی مانگ بیرونی ملکوں میں بڑھ رہی ہے افغانستان سے زرعی مشینوں کا ایک آرڈر ملا ہے جس کی قیمت ۳ ملین ڈالر ہے۔ یہ آرڈر جاپان، انگلینڈ اور اٹلی کے مقابلہ کے باوجود حاصل ہوا ہے۔